Dr shyama parsad mukharjee university,Ranchi

M.A Sem-4

Sub:-Urdu, Paper-403(C)

(۱) کس افسانہ نگار کی تخلیقات پر گاندھیائی فلسفہ حیات کا اثر ہے؟

(الف) منٹو (ب) پریم چند (ج) سجاد حیدر یلدرم

(۲) پریم چند کے پہلے ناول کا نام کیا ہے؟

(الف) گوءدان (ب) اسرار معبد (ج) نرملا

(۳) پریم چند کی اہلیہ کا نام کیا تھا؟

(الف) شیورانی دیوی (ب) آنندی دیوی (ج) سدھا دیوی

(۴) ہندوستان کی جدوءجہد آزادی کو کس ناول کا موضوع بنایا گیا؟

(الف) گوءدان (ب) بازار حسن (ج) میدان عمل

(۵) ذیل میں پریم چند کا مضمون کون سا ہے؟

(الف) کربلا (ب) ادب کی غرض وغایت (ج) نجات

(٦) ذیل میں پریم چند کا کون سا ناول ادھورا رہ گیا؟

(الف) منگل سوتر (ب) چوگان ہستی (ج) نرملا

(۷) پریم چند نے کون سا رسالہ نکالا؟

(الف) آج کل (ب) ہنس (ج) نیا دور

(۸) ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' کی صنفی نوعیت کیا ہے؟

(الف)ڈرامہ (ب)افسانہ (ج)ناول

(۹) پریم چند کے کس افسانوی مجموعے میں داستانوی رنگ موضود ہے؟

(الف)سوز وطن (ب)آخری تحفہ (ج)زادراہ

(۱۰) ''حامد'' کس افسانے کا مرکزی کردار ہے؟

(الف)کفن (ب)نئی بیوی (ج)عیدگاہ

subjective

(۱۱) پریم چند کی سوانح پیش کریں۔

(۱۲) پریم چند کی افسانہ نگاری کا جائیزہ لئے۔

(۱۳) سوز وطن کا مختصر جائزہ لیں۔

(۱۴) پریم چند کے افسانو میں خواتیں کے مسائل کی نشاندہی کرئیں۔

(۱۵) ناول ''میدان عمل'' کا تنقیدی جائیزہ پئش کریں۔

(۱۶) پریم چند کے اسلوب پر روشنی ڈالے۔

(۱۷) پریم چند کے مضامین پر سرسری تبصرہ کرے۔

(۱۸) ناول ''چوگان ہستی کا تنقیدی جائیزہ پیش کرے۔

(۱۹) پریم چند کی خطوط نگاری پر ناقدانہ نگاہ ڈالیں۔

(۲۰) ''کفن'' کا تنقیدی جائیزہ پئش کرے۔

سردار احمد (علیگ)

پریم چند کا ناول "میدانِ عمل"

ایک مطالعہ

اُردو کے افسانوی ادب کے رہنما اور روشن مینار پریم چند کا ناول "میدانِ عمل" ان کی فکر و نظر کا آئینہ دار اور ان کے با مقصد عظیم اور لافانی ادب کا جیتا جاگتا شاہکار ہے۔ اس کی قدر و قیمت سمجھنے کے لیے ہمیں عصر اصلاح کے مصائب و مسائل، تحریکِ آزادی کی زبردست ہلچل، خواجہ کی بلند بامی، بندہ کی کوچہ گردی، سرمایہ و محنت کی کشمکش، انگریزوں کی پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے مکروہ نتائج، غریبی، جہالت، توہم پرستی اور مذہب کی اصل روح سے ناواقفیت، ظلم و جبر کی حکمرانی اور بیکسی و مظلومیت کی بے سروسامانی کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے جس میں پریم چند اور اقبال جیسی عدیم المثال شخصیات نے ادب سے تنقیدِ حیات کا کام

سورت ہے ۵

● جناب سردار احمد (علیگ)، لکچرر شعبۂ اُردو، اسلامیہ کالج، اٹاوہ (یوپی)۔

لیا۔ پریم چند بڑے کھلے ذہن کے ساتھ لکھتے ہیں:

"ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے۔ دل بہلاؤ کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے۔ وہ اب محض عاشقی و عشق کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے اور اُن کا محاسبہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے۔ ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح آرائی نہیں ہے، اس کا مرتبہ اتنا نہ گرایئے۔ وہ وطنیت و سیاست کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔"

("ادب کی غرض و غایت" مضمون از پریم چند مطبوعہ "زمانہ" اپریل ۱۹۳۶ء)

"میدانِ عمل" پریم چند کی وفات (۱۹۳۶ء) سے چند سال قبل منظرِ عام پر آیا۔ اس طرح فنکار کا جو با مقصد سفر "سوزِ وطن" کے افسانوں اور "ہم خرما و ہم ثواب" (۱۹۰۷ء) سے شروع ہوا۔ اس کے تقدیر ساز لمحات کا آخری دور ہے۔ پریم چند کا قلم "میدانِ عمل" میں ہیرو امرکانت کو جس حرکت و عمل اور سوز و ساز زندگی کا امین بنا کر پیش کرتا ہے، اسے پڑھتے ہوئے اقبال کے وہ اشعار خود بخود یاد آتے چلے جاتے ہیں جن میں انھیں صفات کو پیدا کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور سیاسی، ذہنی اور اقتصادی غلامی کے سدِ باب کا یہی حل پیش کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی تقدیر بدلنے کے لیے نیک نہاد اور بے چین پیکروں میں پریم چند بھی بہت سوچ سمجھ کر اپنا قلمی جہاد چھیڑے ہوئے تھے۔ "میدانِ عمل" تک پہنچتے پہنچتے پریم چند کا مطالعہ، تجربہ اور مشاہدہ مختلف تحریکات، نظریات اور مسائل کا احاطہ کر چکا تھا اور آریہ سماجی تحریک کے مثبت اثرات کو قبول کرنے کے بعد گاندھی جی سے قریب تر ہو رہا تھا جس کا اندازہ ان کی اہلیہ شیورانی کی کتاب "پریم چند گھر میں"

کے صفحہ ۱۲۸ پر پریم چند کی بات چیت کے درج ذیل جملوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

"دنیا میں مہاتما گاندھی کو سب سے بڑا مانتا ہوں۔ ان کا بھی مقصد یہی ہے کہ مزدور اور کاشتکار سکھی ہوں، وہ ان لوگوں کو آگے بڑھانے کے لیے آندولن چلا رہے ہیں۔ میں لکھ کر ان کی ہمت بڑھا رہا ہوں۔"

"میدانِ عمل" کا قاری شروع ہی سے جن مرکزی کرداروں میں دلچسپی لیتا ہے وہ امرکانت اور سلیم ہیں۔ امرکانت شمعِ محفل کی طرح سب سے جُدا سب کا رفیق ہے۔ اس کی شخصیت میں کشش ہے۔ اس کی باتوں میں تاثیر اور اس کے عمل میں اخلاص ہے۔ سلیم کھلنڈرا، شوقین مزاج نوجوان ہے لیکن دونوں میں دوستی کا رشتہ موجود ہے۔ امرکانت کے باپ لالہ سمرکانت میں شیکسپیئر کے شائیلاک کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ سنگدلی، سود خواری، چوری کا مال کم داموں میں خریدنا اور مہنگا فروخت کرنا، مذہبی باتوں اور کاموں میں دکھاوا اور نمائش کی کثرت اور انھیں غلط باتوں پر دادِ عیش لالہ سمرکانت کی زندگی ہے، لیکن ان کا بیٹا امرکانت اپنے باپ کی روش، استحصال اور ہتھکنڈوں سے سخت متنفر ہے جس کی وجہ سے باپ بیٹے میں نہیں بنتی۔ اس کے پیچھے ایک نفسیاتی راز یہ بھی ہے کہ امرکانت کی ماں کے مرنے کے بعد لالہ سمرکانت نے دوسری شادی کر لی جس سے امرکانت کی شخصیت میں محرومی کا زہر پیوست ہو گیا اور آگے چل کر اُسے محبّت، ایثار اور آسودگی کی تلاش عمر بھر رہی۔ امرکانت کی سوتیلی بہن نینا کا کردار بھی ناول کی ایک ضرورت ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ یہاں امرکانت کے سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ طالب علمی کے زمانہ ہی میں اس کی شادی ایک امیر گھرانہ کی لڑکی سُکھدا سے کر دی جاتی ہے۔ اس موقع پر ہندوستانی سماج میں لڑکے میں تعلیم و تربیت اور کسی خاص گن کی اہمیت نہ ہو کر صرف

امیر گھر کی لڑکی اور اس کے ساتھ ملنے والی دولت پر نظر اور اپنے غلط صحیح دھندے میں لڑکے کو لگا کر باقی شاہراہِ حیات پر چلتے رہنے کی عکاسی بھرپور کی گئی ہے۔

سُکھدا جس ماحول کی پروردہ ہے وہاں آرام و آسائش، تفریح و لطف، فراغت اور اطمینان نے خود بینی، تکبّر اور تن آسانی کے عیب اس میں بھر دیئے ہیں، جو امرکانت کے فکر و عمل، خواہش و مقصد سے ٹکراتے ہیں۔ پریم چند کے فطرت شناس قلم نے جس چابک دستی اور فنی مہارت سے اس ٹکراؤ کو جگہ جگہ پیش کیا ہے اور امرکانت کے اندر اپنے ماحول سے بلند ہونے اور اپنے گرد و پیش میں انقلاب لانے کے شدید جذبہ کو جس جس طرح ابھارا ہے وہ انھیں کا حصّہ ہے۔ باپ، بیٹے اور شوہر و بیوی کے درمیان اپنے الگ الگ اصول و ضوابط کے باعث دوری بڑھنے لگتی ہے۔ دوسری طرف لالہ سمرکانت پانچ روپیہ ماہوار اپنے ایک مرحوم ملازم کی جس بیوہ کو دیا کرتے ہیں اس کی غریب بیٹی سکینہ سے امرکانت کی ملاقات ہوتی ہے اس کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے امرکانت اس کے پیکر میں سُکھدا کا بدل محسوس کرتا ہے سُکھدا اور سکینہ میں جو نمایاں فرق تھا وہ پریم چند کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

"سُکھدا اپنی بے نیازی اور خود پروری سے اس پر (امرکانت پر) حکومت کرتی تھی، وہ حکومت اسے (امرکانت کو) ناگوار تھی۔ سکینہ اپنے انکسار اور شیریں زبانی سے اس پر (امرکانت پر) حکومت کرتی تھی، وہ حکومت اسے قبول تھی۔ سُکھدا میں اختیار کا غرور تھا سکینہ میں تسلیم کی عاجزی"۔

"میدانِ عمل" ناول کی کہانی اپنے ساتھ میں پورے ہندوستان کی شہری اور دیہاتی زندگی کی آسائشوں و آلائشوں، آنسوؤں اور مسکراہٹوں، بلندی و پستی کرب و طرب اور مسائل و وسائل کی جیتی جاگتی دنیا لیے آگے بڑھتی ہے جس کی خوشبو

پریم چند کی اپنی سانسوں میں رچی بسی ہوئی تھی۔ تحریکِ آزادی آگ کی طرح پھیل رہی ہے۔ انقلاب کے نعرے دھرتی اور آکاش کو ایک کیے دے رہے ہیں۔ سرفروشی کی تمنا ہے اور انگریز کے جبر و زیادتی کی انتہا ہے۔ امر کانت اخباروں کے مطالعہ سے قومی رہنماؤں کی حریت پسندی کی عملی تائید کے لیے اور اپنی سیاسی بیداری کے نتیجے میں اپنے شہر کی کانگریس کمیٹی کا ممبر بن گیا اور ان کے جلسوں میں شریک ہونے لگا۔

امر کانت کو سکھدا کی ماں رما دیوی اپنے ڈھرے پر چلانے اور لانے کی کوشش کرتی ہے۔ امر کانت کا دل سکینہ نے جیت لیا ہے وہ اس جنسی کشش کے چھپانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ لیکن وقت کی پکار، دیس کی آواز اور چاروں طرف پھیلی ہوئی سسکیوں اور کراہوں کی صدائیں کچھ اور چاہتی ہیں۔ امر کانت اپنا میدانِ عمل شہر سے گاؤں میں منتقل کرتا ہے۔ جہاں ذات پات کی تفریق، اچھوتوں کی زبوں حالی، فرسودہ رسم و رواج کی زنجیریں اور جہالت کا اندھیرا عام ہے۔ امر کانت مظلوم اور گونگے عوام کی زبان بن جاتا ہے۔ اچھوتوں کی بستی اور رہائش کا بیان امر کانت کی زبان میں:

"پتھر کے ناہموار ٹکڑوں کو اوپر نیچے رکھ کر دیواریں بنائی گئی ہیں، ان میں چھپر ڈال دیئے گئے ہیں۔ دروازوں پر ٹکٹ کی ٹٹیاں ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑھیا کے ساتھ جھونپڑے میں گیا تو دل کانپ گیا گویا افلاس چھاتی پیٹ پیٹ کر رو رہا ہو۔"

یہی افلاس کے مارے ٹھاکر دوارے میں کتھا سننے جاتے ہیں وہ منظر بھی "میدانِ عمل" میں دیکھیے:

"زیادہ تر لوگ ننگے بدن تھے، خال خال پھٹے پرانے کپڑے پہنے

نظر آتے تھے ان کے جسم سے تمباکو اور کثافت کی بُو آرہی تھی، مردوں سے
زیادہ عورتیں تھیں میلی بدسلیقہ۔"

"میدانِ عمل" میں اچھوتوں کے مندروں میں داخلہ پر پابندی کا بھی مسئلہ پیش کیا گیا ہے اور اچھوتوں میں چھوت چھات کے رسم ورواج اور عقیدہ کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے لیے دل کو چھو لینے والے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ ٹھاکر دوارے میں کتھا ایک ماہ سے ہو رہی تھی، لیکن جب پنڈت جی کو معلوم ہوا کہ جوتوں کے پاس پیچھے اگر کچھ اچھوت بھی کتھا سنتے ہیں تو انھوں نے:

"اپنا سر پیٹ لیا، یہ بدمعاش روز یہاں آتے تھے اور سب کو
چھوتے تھے ان کا چھوا پرشاد روز لوگ کھاتے تھے۔ اس سے
بڑھ کر اندھیر اور کیا ہو سکتا ہے ..... کئی آدمی جوتے لے کر
ان غریبوں پر پل پڑے۔"

یہ گاؤں امرکانت کے میدانِ عمل بنے اور وہ جس شہر کو خیرباد کہہ کر آیا وہاں اس کی بیوی سُکھدا نے اس کی اندر تبدیلی پیدا کی اُس نے سخت کوشی کی زندگی کو اپنانے اور دوسروں کی خدمت میں سکھ پانے کی عظمت اور حقیقت کو سمجھ لیا اور وہ ایسی عوامی رہنما کے روپ میں سامنے آئی جس نے پورے شہر میں اچھوتوں کے مسئلے کو لے کر ہڑتال کرادی اور اپنی جدوجہد میں کامیاب ہوئی۔ پریم چند کا قلم اب سکھدا کی تصویر پیش کرتا ہے:

"اور سُکھدا وہ تو فتح کی دیوی تھی، قدم قدم پر اس کے نام پر
نعرے اٹھتے تھے، کہیں پھولوں کی برکھا ہوتی تھی، کہیں
کہیں روپوں کی، گھنٹہ بھر پہلے شہر میں اس کا کہیں شمار نہ تھا
اس وقت وہ شہر کی رانی ہے ..... مگر اتنا انکسار، اتنی فروتنی

Scanned by CamScanner

اتنا اخلاق اس میں بھی نہ تھا گویا اس تحسین اور احترام کے
بوجھ سے اس کا سر جھکا جاتا ہو۔"

دیہات میں امرکانت اپنے مشن کی کامیابی کے لیے جدوجہد میں معروف تھا، وہیں منی کا کردار سامنے آتا ہے جس کے شوہر کے انتقال کے بعد اس کے مقدمہ کی پیروی امرکانت اس لیے کرتا ہے کہ وہ مظلوم، بے سہارا اور کمزور ہے اور اچھوتوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہے۔ کسانوں کی تحریک کی ابتدا امرکانت نے کی اور اس سے بیداری کی جو لہر اٹھی اس سے انگریز حکومت خوفزدہ ہوئی نتیجے میں امرکانت کی گرفتاری عمل میں آئی وہ بھی اس کے بچپن کے دوست سلیم کے ہاتھوں جو اس وقت ضلع کا حاکم تھا۔ لالہ سمرکانت گاؤں پہنچکر سلیم کو لتاڑتے ہیں۔ سلیم کو اپنے کیے پر پچھتاوا ہوتا ہے اور وہ حکومت کو سرکاری مظالم اور کسانوں کی مظلومیت اور پریشان حالی کی صحیح اور سچی رپورٹ لکھ بھیجتا ہے جس کی وجہ سے اس کی ملازمت چھن جاتی ہے اور وہ بھی اسی جیل میں قید ہوتا ہے جہاں امرکانت قید ہے۔

ناول کے شروع میں امرکانت کی سوتیلی بہن نینا کا کردار آگے چل کر بہت بڑی قربانی پیش کرتا ہے۔ نینا کی شادی آوارہ مزاج اور بدکردار لڑکے منی رام سے اس کے باپ سمرکانت نے کر دی تھی، دونوں میں کبھی کوئی ہم آہنگی نہ ہو سکی، جس وقت امرکانت، سکھدا اور سلیم جیل میں تھے اور کسانوں کی تحریک کی رہنمائی سکینہ بڑے دم خم کے ساتھ کر رہی تھی، اس وقت لالہ سمرکانت اور سلیم کے والد حافظ حلیم بھی عوامی طاقت اور آنے والے دور کی عوامی حکومت کی سچائی کو قبول کر چکے تھے اور اب عوامی تحریک میں دل و جان سے شامل تھے لیکن نینا کا شوہر اپنی رجعت پرستی اور عیش پسندی پر اڑا ہوا تھا۔ اس نے ایک

Scanned by CamScanner

روز اپنی بیوی نینا کو تقریر کرنے کی حالت میں قتل کر دیا۔ اس خون نے تحریک میں نئی طاقت پھونک دی۔ ایثار و قربانی کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ لکھنؤ جیل میں امرکانت کی زندگی میں ایک واقعہ نے انقلابِ عظیم پیدا کر دیا اور وہ اپنی پچھلی زندگی پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے اس کے صالح عناصر کو لے کر ایک بہترین انسان بن گیا۔ واقعہ کالے خاں قیدی کا نماز پڑھنے اور اپنے اللہ کے آگے سجدہ کرتے ہوئے پولیس کے ڈنڈوں سے جاں بحق ہونے کا ہے۔ یہی کالے خاں امرکانت کے حصہ کا اناج بھی چکی میں پولیس سے چھپ کر ازراہِ ہمدردی پیس دیا کرتا تھا۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں اور اپنے گرد و پیش کی سچائیوں نے امرکانت کو اس تقدس سے آشنا کر دیا جس کے بغیر حق آشنائی ناممکن ہے۔ ناول کا اختتام حق کی جیت پر ہوتا ہے۔ کسانوں کی دادرسی کے لیے حکومت تیار ہوتی ہے۔ سامراجیت اور جہالت کی طاقتیں دم توڑنے لگتی ہیں۔ امرکانت اور سکھدا، سلیم اور سکینہ ازدواجی رشتوں کی کامیابی کا راز سمجھ لیتے ہیں اور خدمت و ایثار کا نمونہ بنتے ہیں۔

پریم چند نے اپنے وقت کے ہندوستان کی ہنگامہ خیز زندگی کے مسائل اور ان کے حل جس دل نشیں اندازِ بیان اور ڈرامائی کیفیات کے ساتھ پیش کیے ہیں وہ آج بھی قابلِ توجہ ہیں۔ ان کا قلم خلوص کی تاثیر لیے ہوئے مظلوم کا حامی ظالم کا دشمن اور انسانیت کا ترجمان ہے۔ یہ قلم نہ استحصال کرنے والے برہمن اور پنڈت ہی کو بخش سکتا ہے اور نہ ریاکار مولوی و مُلّا ہی کو آزاد چھوڑتا ہے۔ یہ قلم تمام تعصبات سے پاک، تمام تنگ نظریوں سے بلند اور تمام محبتوں سے لبریز ہے۔ جس کا ایک نمونہ "میدانِ عمل" بھی ہے۔

"میدانِ عمل" میں اصلاح اور انقلاب کی تحریک دوش بدوش لے کر چلنے میں پریم چند کے کردار اپنے خالق کے نظریوں اور آدرشوں کی خوب خوب

Scanned by CamScanner

ترجمانی کرتے ہیں۔ امرکانت ذات پات کے بھید بھاؤ کے خلاف اس طرح اعلان کرتا نظر آتا ہے۔

"میں ذات پات نہیں جانتا جو سچا ہو وہ چمار بھی ہو تو عزت کے لائق ہے۔ جو دغاباز، جھوٹا اور مکّار ہو وہ برہمن بھی ہو تو عزّت کے لائق نہیں۔"

ہندوستان میں مذہبیت عام ہونے اور روحانیت گم نام ہونے کا شکوہ پریم چند کو بھی رہا۔ اس کی اصلاح کے لیے بھی "میدانِ عمل" میں کافی زور دیا گیا ہے۔ سمرکانت کے کردار کی آڑ لے کر پریم چند نے دکھاوے کے مذہب کا خوب مذاق اُڑایا ہے۔ ایک جھلک ملاحظہ فرمایئے:

"سمرکانت کی عملی زندگی اُن کی مذہبی زندگی سے بالکل الگ تھی۔ دنیاوی معاملات اور لین دین میں وہ دھوکے دھڑی، دغا فریب سب کچھ جائز سمجھتے تھے۔ اُن کے آئینِ تجارت میں سَن یا کپاس میں کوڑا بھر دینا، گھی میں آلو یا گھُیّاں ملا دینا جواز کے دائرے سے باہر نہ تھا مگر بغیر نہائے منہ میں پانی ڈالنا بھی ایسا گناہ تھا جس کا کوئی کفارہ نہ تھا۔ ان چالیس برسوں میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہوا ہو کہ انھوں نے شام کی آرتی نہ کی ہو۔ تلسی دل مالا تھے پر نہ چڑھایا ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان کا مذہب نمائش کی چیز تھا جس کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔"

"میدانِ عمل" میں عورتوں کے کردار میں ہندوستانی عورت کی تمام جلوہ سامانیاں موجود ہیں۔ جس میں شوہر سے وفاداری، عزّت و ناموس کی حفاظت

Scanned by CamScanner

شرم وحیا کا احساس اور بے خوفی و یقین کی صفات دامنِ دل کھینچتی ہیں۔ اس ناول میں جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے وہ پریم چند کی دیگر تخلیقات کی طرح ان کے اجتماعی، سماجی اور جمہوری شعور کا مظہر ہے۔ پریم چند کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ ان کی صداقت، ان کی تڑپ، ان کی حریت پسندی، انسانیت دوستی اور بے باکی و بے خوفی کا زندۂ جاوید نقش ہے۔

Scanned by CamScanner

کوائف

۳۱ر جولائی ۱۸۸۰ : پریم چند کی ولادت۔ موضع لمہی ضلع بنارس۔ بچپن کا نام دھنپت رائے عرف نواب رائے

قلمی نام : پریم چند

والد : منشی عجائب لال۔ ملازم ڈاکخانہ

والدہ : آنندی دیوی

ابتدائی تعلیم : گاؤں کے مکتب میں اُردو فارسی پڑھی

۱۸۸۸ : والدہ کے انتقال کے بعد والد نے دوسری شادی کر لی

۱۸۹۳ : چھٹی جماعت میں داخلہ، مشن اسکول۔ گورکھپور

۱۸۹۶ : نویں جماعت میں داخلہ، کوئنس کالج بنارس
پہلی شادی موضع رام پور ضلع بستی کے زمین دار کی لڑکی سے

۱۸۹۷ : والد کا انتقال

۱۸۹۸ : میٹرک کا امتحان سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا
پانچ روپے ماہوار اپر وکیل کے بچوں کا ٹیوشن

۱۸۹۹ : اسسٹنٹ ماسٹر۔ پرائمری اسکول تنخواہ ۱۸ر روپے

۱۹۰۰ : اسسٹنٹ ٹیچر۔ گورنمنٹ اسکول۔ بہرائچ

۱۹۰۲ : ٹیچر ٹریننگ۔ الہ آباد، ہیڈ ماسٹر۔ ٹریننگ ماڈل اسکول الہ آباد

۱۹۰۳ : پہلا ناول۔ اسرار معابد۔ قسط وار آواز خلق میں

۱۹۰۴ : جونیر انگلش ٹیچر سرٹیفکیٹ کورس پاس کیا۔ الہ آباد یونیورسٹی سے اُردو ہندی

Scanned by CamScanner

ورنیکولر امتحان پاس کیا گورنمنٹ اسکول پرتاب گڑھ میں تقرر
ناول ہم خرما وہم ثواب۔ مہادیو پرساد نے لکھنؤ سے شائع کیا

۱۹۰۵ : گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور میں تبادلہ

۱۹۰۶ : پہلی شادی ناکام ہونے پر دوسری شادی شورانی دیوی سے کی

۱۹۰۷ : اُردو ناول کرشنا کی اشاعت
پہلی کہانی۔ دنیا کا سب سے انمول رتن شائع ہوئی

۱۹۰۸ : زمانہ کانپور میں افسانوں کے پہلے مجموعے سوز وطن کا اشتہار شائع ہوا۔
سب انسپکٹر مدارس۔ مہوبہ ضلع ہمیر پور

۱۹۰۹ : سوز وطن کی اشاعت۔ نواب رائے کے نام سے حکومت نے سوز وطن کو ضبط کرلیا

۱۹۱۰ : قلمی نام پریم چند کے نام سے لکھنا شروع کیا
انٹر کا امتحان سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا
افسانہ بڑے گھر کی بیٹی شائع ہوا

۱۹۱۲ : ناول جلوۂ ایثار شائع ہوا

۱۹۱۴ : ضلع بستی میں تبادلہ ہوا پنچس کی شکایت شروع ہوئی
بطور ماسٹر نارمل اسکول بستی میں تقرر
افسانوں کے مجموعہ پریم پچیسی حصہ اوّل کی اشاعت

۱۹۱۶ : اسسٹنٹ ٹیچر کی حیثیت سے نارمل اسکول گورکھپور میں تبادلہ

۱۹۱۸ : بڑے بیٹے شری پت رائے کی ولادت
پریم پچیسی حصہ دوم کی اشاعت

۱۹۱۹ : دوسرے لڑکے کی ولادت اور موت
بی۔ اے کا امتحان انگریزی، فارسی اور تاریخ کے مضامین کے ساتھ پاس کیا

۱۹۲۰ : گورکھپور میں گاندھی کی آمد۔ اور عدم تعاون کی تحریک سے متاثر ہوکر سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا

Scanned by CamScanner

پریم بتیسی حصہ اوّل کی اشاعت، پریم بتیسی حصہ دوم کی اشاعت

۱۹۲۱ : ماروازی مہادویالیہ کانپور میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے
چھوٹے لڑکے امرت رائے کی ولادت

۱۹۲۲ : ماروازی اسکول کی ملازمت سے استعفیٰ دیا
مریادا کے ایڈیٹر مقرر ہوئے
ناول بازارِ حسن کی اشاعت

۱۹۲۳ : شرکت میں سرسوتی قایم کیا

۱۹۲۴ : گنگا پستک مالا لکھنؤ میں ملازمت/کربلا کی اشاعت

۱۹۲۵ : ناول نرملا کی رسالہ چاند میں قسط وار اشاعت

۱۹۲۶ : بنارس میں قیام

۱۹۲۷ : ناول چوگانِ ہستی کی اشاعت

۱۹۲۸ : اکلوتی بیٹی کی شادی
افسانوں کے مجموعہ: خاک پروانہ کی اشاعت
افسانوں کے مجموعہ: خواب وخیال کی اشاعت

۱۹۲۹ : رسالہ مادھوری نولکشور پریس لکھنؤ کے مدیر مقرر ہوئے
افسانوں کے مجموعہ فردوس خیال کی اشاعت
ناول نرملا کی اشاعت

۱۹۳۰ : نجی رسالہ جنس کا اجرا
افسانوں کے مجموعہ: پریم چالیسی حصہ اوّل کی اشاعت
افسانوں کے مجموعہ: پریم چالیسی حصہ دوم کی اشاعت

۱۹۳۱ : ہفتہ وار جاگرن کے مدیر مقرر ہوئے
نمک کا قانون توڑنے پر اہلیہ شورانی کی گرفتاری
ناول پردۂ مجاز کی اشاعت

۱۹۳۲ : ناول: میدانِ عمل کی اشاعت

Scanned by CamScanner

ناول: گئودان کی اشاعت

۱۹۳۴ : اجنتا سے فلم کے لیے مل مزدور کی کہانی لکھنے بمبئی پہنچے

افسانوں کے مجموعہ: آخری تحفہ کی اشاعت

۱۹۳۵ : بمبئی سے بنارس واپسی

۱۹۳۶ : ۹/۱۰/اپریل کو لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے پہلے اجلاس کی صدارت اور خطبہ

افسانوں کے مجموعہ: زادراہ کی اشاعت

افسانوں کے مجموعہ: دودھ کی قیمت کی اشاعت

۱۶/جون کو خون کی قے اور دست

۱۹/جون کو میکسم گورکی کے انتقال پر جلسے میں شرکت

۲۵/جولائی کو پھر خون کی قے

۲/اگست کو لکھنؤ میں ایکسرا

۸/اکتوبر کو صبح ساڑھے سات بجے انتقال

انتقال کے وقت ان کی عمر ۵۶ برس

۱۹۳۸ : واردات (افسانوں کے مجموعہ) کی اشاعت

☆☆

Scanned by CamScanner

چوگان ہستی

''چوگان ہستی'' پریم چند کا ایک اہم اور ممتاز ناول ہے یہ ناول 1924 میں لکھا گیا اور 1927 میں شائع ہوا، ڈاکٹر قمر رئیس کا خیال ہیکہ ''یہ ناول 1924 میں گنگا پستک مالا آفس کے زیر اہتمام ہندی میں شائع ہوا اور دیا نرائن نگم کے قول کے مطابق اس ناول کی پہلی اشاعت کا معاوضہ پریم چند کو دو ہزار روپئے ملا اردو میں اسکا پہلا ایڈیشن 1927 میں دارالاشاعت لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا''[1]

''چوگان ہستی'' پریم چند کا سب سے ضخیم ناول ہے جو ایک ہزار صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس میں پریم چند نے بہت گہرائی کے ساتھ ہندوستانی زندگی کے گوناگوں مسائل کو پیش کیا ہے بقول قمر رئیس

> ''ہندوستان کی قومی زندگی کے جتنے مسائل اور خود زندگی کی جتنی وسیع تصویر اس ناول میں ہے وہ گئودان کے علاوہ کسی اور ناول میں نہیں ملتی''[2]

پریم چند نے خود بھی اس ناول کو اپنا بہترین ناول قرار دیا ہے، اس ناول میں ہندوستانی زندگی کے ہر رخ کو اور ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کے اہم ترین دور کو اسکی پوری وسعت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے گویا یہ ''ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کا مکمل اشاریہ ہے اور گاندھی جی کے فلسفہ عدم وتشدد کی بھرپور تفسیر ہے، عدم وتشدد کی وہ جنگ جو مہاتما گاندھی کی

---

1. قمر رئیس۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ص 236
2. .. .. ص 236

Scanned by CamScanner

سرکردگی میں ابتدا سے اس ناول کے لکھے جانے تک لڑی گئی اسکی پوری تصویر کشی ''چوگان ہستی'' میں ہوتی ہے''[1]

بہر حال یہ ناول جب لکھا گیا اس وقت سیاسی اعتبار سے ملک بہت کشمکش اور ہیجانی دور سے گزر رہا تھا، عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک زوروں پر تھی، مہاتما گاندھی کی شخصیت اور انکا فلسفہ عدم وتشدد ہندوستانی سیاست پر پوری طرح چھایا ہوا تھا، ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں کانگریس نے اپنے تاریخی اجلاس میں نہ صرف عدم وتشدد اور عدم تعاون کے پروگرام کو پورے استحکام کے ساتھ جاری رکھنے کا فیصلہ لیا بلکہ سول نافرمانی کو منظم کرنے اور مہاتما گاندھی کی قیادت میں قومی تحریک کی ساری ذمہ داری بھی سونپ دی گئی، ان حالات میں جبکہ مہاتما گاندھی کی قیادت میں جدو جہد آزادی کی تحریک اپنے عروج پر پہونچ چکی تھی، چوری چورا کا واقعہ پیش آیا جس میں مشتعل ہجوم نے پولس کے ظلم وستم سے تنگ آکر پولیس اسٹیشن کو آگ لگادی تھی، جسکی وجہ سے کئی پولیس والے جل کر ہلاک ہوگئے تھے اس حادثہ سے گاندھی جی اس درجہ متاثر ہوئے کہ سول نافرمانی کی تحریک غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کردی، کیونکہ گاندھی جی اس تحریک کو عدم وتشدد کی بنیاد پر چلانا چاہتے تھے، گاندھی جی کے اس فیصلہ سے دوسرے کانگریسی رہنما ناراض بھی ہوئے، لیکن اس واقعہ کے بعد بھی گاندھی جی نے اپنے قول و فعل کی یکسانیت اور مطابقت کو صحیح ثابت کر دکھایا گاندھی جی کا یہ قدم انکی جراعت کی ایسی مثال ہے جسکا جواب تاریخ میں نہیں ملتا۔

اس ناول میں ہندوستان کی کم وبیش پوری زندگی سمٹ آئی ہے، زندگی کے ہر گوشہ پر روشنی ڈالتے ہوئے خاص طور پر سیاسی جدو جہد وکشمکش کا بھرپور اظہار ملتا ہے، جگہ جگہ عدم وتشدد اور سول نافرمانی کی تحریک کی جھلک نظر آتی ہے، انمیں گاندھی جی کے خوابوں

Scanned by CamScanner

کی تعبیر وتفسیر بھی ملتی ہے، اسکی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ اسی بیچ پریم چند گاندھی جی سے متاثر ہوکر اپنی ملازمت سے استعفیٰ دیکر تحریک آزادی میں عملی طور پر شامل ہوجاتے ہیں پریم چند نے اندھے سورداسؔ کے کردار میں جدوجہد آزادی کو پیش کرتے ہوئے پوری تحریک اور جنگ آزادی کو سمیٹ لیا ہے، راجہ مہاراجہ، تعلقدار، انگریز حکام، کسان مزدور وغیرہ کردار نظر آتے ہیں جو اپنے حقوق کیلئے کوشاں ہیں۔

مہاتما گاندھی جی کی قیادت میں آزادی کی تحریک پورے ملک میں پھیل چکی تھی اور پریم چند خود گاندھی جی سے بے انتہا عقیدت رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اس ناول میں پریم چند عملی طور پر گاندھی جی کے پیرو نظر آتے ہیں اور گاندھی واد کا پوری طرح پرچار کیا ہے۔

پریم چند نے سورداسؔ کے کردار میں گاندھی جی کے عدم وتشدد کا پورا فلسفہ پیش کرتے ہوئے پوری تحریک آزادی کا احاطہ کیا ہے، یہ ایک علامت کی حیثت رکھتا ہے جو گاندھی جی کی سرکردگی میں عدم تشدد کے ذریعہ لڑی جارہی تھی سورداسؔ اپنے حق کیلئے اپنی زمین کیلئے لڑتا ہے، جان سیوکؔ سورداسؔ سے اسکا یہ حق یعنی اسکی زمین چھین لینا چاہتا ہے، ان دونوں کرداروں کی جدوجہد سے پورا ناول تشکیل پاتا ہے، لیکن پریم چند کے فن کا کمال یہ ہے کہ ان دونوں کی جدوجہد کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ نہ صرف ہندوستان کی جدوجہد آزادی بلکہ ہندوستانی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر طبقے کے حالات سامنے آجاتے ہیں۔

''چوگان ہستی'' کا سب سے نمائندہ کردار ''سورداسؔ'' ہے جسطرح گوشہ عافیت میں، منوہرؔ، بلراجؔ اور قادر خان لکھن پور کو زمینداروں کی لوٹ کھسوٹ سے نجات دلانے کیلئے جدوجہد کرتے ہیں اسی طرح اس ناول میں سورداسؔ تنہا پانڈے پور کو سرمایہ

Scanned by CamScanner

داروں کے چنگل سے بچائے رکھنے کیلئے لڑتا ہے، اسکی لڑائی پوری طرح ستیہ گرہ اور عدم تشدد پر مبنی لڑائی ہے، سورداس کے کردار میں گاندھی جی کے خیالات کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، سورداس ہر ظلم کے خلاف نعرہ احتجاج بلند کرتا ہے، یہاں تک کہ عدالت کی ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے سے نہیں ڈرتا ہے، خدا پر اسکا ایمان بھی ہے زمین کے مسئلے پر جان سیوک کے کہنے پر وہ کہتا ہے کہ بھگوان کی جو مرضی ہے وہ کرر ہا ہوں کیونکہ خدا کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا ہے، گاندھی جی کی طرح ہر ظلم کے خلاف ستیہ گرہ کرتا ہے، تشدد اور اشتعال سے دور رہتا ہے جب اسکی زمین جبراً چھین لی جاتی ہے اور اس پر کارخانہ قائم ہو جاتا ہے تو بستی کے لوگ کارخانہ کو نقصان پہونچانے کیلئے پتھراؤ کرتے ہیں مگر ایک سچے ستیہ گرہی کی طرح سورداس بستی کے لوگو کو اس تشدد سے روکتے ہوئے کہتا ہے:

''آگ لگانے سے میرے دل کی آگ نہ بجھے گی لہو بہانے سے میرا دل شانت نہ ہوگا، آپ لوگوں کی دعا سے یہ آگ اور یہ جلن شانت ہوگی، پرتما سے کہیں میرا دکھ مٹائیں، بھگوان سے بنتی کیجئے میرا سنکٹ ہریں۔ جنہوں نے مجھ پر ظلم کیا ہے، ان لوگوں کے دل میں دیا دھرم جاگے، بس میں آپ لوگوں سے کچھ نہیں چاہتا''[1]

سورداس ستیہ گرہ کی لڑائی لڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ جس کام کو جائز سمجھتا ہے اسکے لئے اپنی جان کی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتا، کیونکہ جان سیوک اسکی ورثہ میں ملی ہوئی زمین کو حاصل کرکے جب اس پر کارخانہ قائم کرنا چاہتا ہے تو سورداس اپنے پرکھوں کی نشانی بیچنے سے انکار کردیتا ہے، وہ اس زمین سے اپنے باپ دادا کی عاقبت سنوارنے کا کام لینا چاہتا ہے، اسکا ایمان ہے کہ اگر اس زمین کو مذہبی یا انسانی بھلائی کیلئے استعمال کیا جائے گا تو اس سے اس کے خاندان کے لوگوں کو نجات مل جائیگی۔ چونکہ سورداس گاندھیائی

---

[1] پریم چند۔ چوگان ہستی، ص:374

خیالات کا حامل ہے اس وجہ سے اسکا ایمان ہے کہ کارخانہ قائم ہونے کے بعد گاؤں میں اخلاقی گراوٹ آئے گی، جرائم فروغ پائیں گے، جس کی ذمہ داری اس پر عائد ہوگی ،اس لئے وہ بڑی صفائی سے مسٹر سیوک سے کہتا ہے:

''بہت ٹھیک کہتے ہیں محلے کی رونق ضرور بڑھے گی لوگوں کو فائدہ بھی خوب ہوگا، جہاں یہ رونق بڑھے گی وہاں تاڑی شراب کا پرچار بھی ہوگا، کسبیاں بھی تو آکر بس جائیں گی، دیہات کے کسان اپنا کام چھوڑ کر مجوری کیلئے دوڑیں گے یہاں بری باتیں سیکھیں گے .....دیہاتوں کی بہو بیٹیاں مجوری کرنے آئیں گی اور یہاں پیسہ کے لوبھ میں اپنا دھرم بگاڑیں گی۔''[1]

سورداس اپنی زمین کو بچانے کے لئے پرامن طور سے جدوجہد کرتا ہے ،مگر اس کو ناکامی ہوتی ہے یہاں تک کہ اس کا جھونپڑا بھی خالی کروالیا جاتا ہے مگر وہ سچے ستیہ گرہی کی طرح تمام طاقتوں کا پرامن طریقہ سے مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے گولیوں کی بوچھار میں بھی اس پر خوف طاری نہیں ہوتا اپنی جھونپڑی کی حفاظت کے لئے اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے مگر تشدد کا راستہ نہیں اختیار کرتا اور اپنی شکست بھی تسلیم نہیں کرتا اور نہ ہی آخری دم تک ہمت ہارتا ہے وہ بڑے اعتماد اور فخر سے کہتا ہے:

''ہم ہارے تو کیا میدان سے بھاگے تو نہیں روئے تو نہیں، دھاندلی تو نہیں کی، پھر کھیلیں گے جرا دم تو لے لینے دو، ایک نہ ایک دن ہماری جیت ہوگی ضرور ہوگی۔''[2]

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ سورداس کا یہ خیال تھا کہ کارخانہ کے قیام کے

Scanned by CamScanner

بعد گاؤں بہت ساری برائیاں پھیلے گی اور گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عزت بھی محفوظ بھی نہیں رہ پائے گی بالا آخر یہ برائی کارخانہ کے قیام کے بعد گاؤں میں آ ہی جاتی ہے کارخانہ کے مزدور جب ایک گھسیاری کو چھیڑتے ہیں تو سورداس مزاحمت کرتا ہے:

''یاروں کیوں اپنی زبان خراب کرتے ہو وہ بے چاری تو اپنی راہ چلی جاتی ہے، اور تم لوگ اسکا پیچھا نہیں چھوڑتے وہ بھی تو کسی کی بہو بیٹی ہوگی!؎۱

جس کے جواب میں مزدور اسکی ٹانگ پکڑ کر اس زور سے کھینچتے ہیں کہ وہ بری طرح زخمی ہو جاتا ہے، دانت ٹوٹ جاتے ہیں ہونٹ کٹ جاتا ہے اور کئی دنوں تک بیہوشی کے عالم میں پڑا رہتا ہے لیکن اس کے باوجود نائک رام کے پوچھنے پر نہیں بتاتا ہے کہ چوٹ کس کے ہاتھوں لگی ہے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نائک رام غصہ میں آ جائے گا تو مرنے مارنے سے نہ ڈرے گا ادھر سورداس بستر علالت پر پڑا ہوا ہے اور پانڈے پور کی قسمت کا فیصلہ ہوتا ہے راجا مہیندر سنگھ مسٹر جان سیوک پولیس کے چند سپاہی اور ایک داروغہ پانڈے پور آتے ہیں، اس وقت راجا صاحب نے محلے کے لوگوں کو جمع کر کے کہا کہ سرکار ایک خاص کام کے لئے محلے کو حاصل کرنا چاہتی ہے جسکا معقول معاوضہ دیا جائے گا تم لوگوں کو جو عرض و معروض کرنی ہے وہ سرکار سے کرنا مجھے صرف حکم کی تعمیل کرنی ہے مگر کسی کی جرعت نہیں جو اسکی مخالفت کر سکے گاؤں کے کچھ لوگ تشدد کا راستہ اختیار کرنے کی باتیں کرتے ہیں لیکن سورداس سمجھاتا ہے:

''یہ ہمارا گھر ہے کسی کے کہنے سے نہیں چھوڑ سکتے جبر دستی سے جو چاہے نکال دے نیائے سے نہیں نکال سکتا تمھارے ہاتھ میں بل ہے تم ہمیں مار سکتے ہو ہمارے ہاتھ میں بل ہوتا تو ہم تمہیں مارتے

۱۔ پریم چند۔ چوگان ہستی، جلد دوم، ص: 214

،سرکار کے ہاتھ میں مارنے کا بل ہے ہمارے ہاتھ میں اور کوئی بل نہیں ہے، تو مرجانے کا بل ہے''[1]

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں سورداس پوری طرح سے ستیہ گرہی ہے اور عدم تشدد کا پابند ہے اور یہی وجہ ہے کہ سورداس اصولوں کی سختی کی وجہ سے عام انسانوں سے الگ اور حد درجہ مثالی معلوم ہوتا ہے روزمرہ کی زندگی میں شاید ہی کوئی انسان ہو جس سے کوئی لغزش نہ ہوتی ہو لیکن سورداس کا کردار ایک فرشتہ صفت معلوم ہوتا ہے جس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی، سورداس کی انھیں خوبیوں اور اصولوں کی سختی کیوجہ سے ڈاکٹر قمر رئیس نے اسکی کردار کی وضاحت کچھ اس طرح کی ہے:

''سورداس بھی ایک سچے ستیہ گرہی طرح جان دیدیتا ہے ،وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے اور اسے سچائی یا انسانیت کے روپ میں دیکھتا ہے، اسکی ساری زندگی کی جدو جہد کا مقصد سچائی کی تلاش اور اسکا تحفظ ہے پریم چند نے اسے سچائی کی تلاش اور انصاف کا اوتار دکھا کر امر بنادیا ہے وہ کبھی نہیں مرسکتا اسلئے کہ سچائی کبھی نہیں مرتی گوشت پوشت کا آدمی اور کمزور انسان ہوتے ہوئے وہ عام انسانوں سے بہت بلند ہے.... سورداس ایک چٹان کی طرح ہماری نظروں کے سامنے کھڑا رہتا ہے یہ پریم چند کا گاندھی وادہی ہے جس نے ایسے کردار کی تخلیق کی..... یہ سوال علحدہ ہے کہ وہ جس تصور حیات کی نمائندگی کرتا ہے وہ اجتماعی زندگی کے مختلف التوع مسائل کو سلجھانے اور ایک بہتر معاشرہ کی تعمیر میں کہاں تک رہنمائی کرسکتا ہے''[1]

Scanned by CamScanner

سورداس کی طرح رانی جانہوی ناول کا دوسرا اہم کردار ہے جس کے ذریعہ پریم چند نے ایسی ہندستانی عورت کی تصویر پیش کی ہے جو بیدار ذہن رکھنے والی عورت ہے، اس کردار کے ذریعہ پریم چند نے حوصلہ جرعت ہمت اور خوداری کی تصویر پیش کی ہے، وہ مذہبی رسوم وعقائد کی پابند ضرور ہے لیکن اسکا دل قوم کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور وہ قومی خدمت، قربانی اور ایثار کیلئے میدان عمل میں اتر آتی ہے، ڈاکٹر قمر رئیس کردار نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''رانی جانہوی ایک خوددار قوم پرست اور حوصلہ مند عورت ہے، مسٹر سیوک کی طرح وہ بھی مذہبی عقائد کو دل سے مانتی ہے، لیکن مسٹر سیوک کی طرح تنگ دل خودغرض اور حاسد نہیں ہے، اس کے دل میں غلامی کے لعنتوں میں تڑپتی ہوئی پوری قوم کا درد ہے، ایثار وقربانی اور خدمت اسکی زندگی کا آدرش ہے''[1]

رانی جانہوی کا کردار ایک مثالی اور زندہ کردار ہے، جس کے دل میں عوام سے محبت ملک کی خدمت کا جوش قوم کے لئے ایثار کا جذبہ اور آزادی کیلئے جان دے نے کی خواہش بھی نظر آتی ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے بچے ''ونے'' کو بھی ایک آدرش کے سانچے میں ڈھالتی ہے وہ چاہتی ہے کہ رانا پرتاپ کی طرح وہ قوم کا سر اونچا کرے، اور اسے بچپن ہی سے شخصیوں کی عادی بنادیتی ہے۔

ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں نہ معلوم کتنی ایسی عورتوں کے نام ملتے ہیں جنہوں نے اپنی تمام دولت اور زندگی اپنی اولاد اور عزیزوں کو ملک کی آزادی پر مسکراتے ہوئے قربان کردیا، رانی جانہوں کی ہمت واستقلال

Scanned by CamScanner

اور جذبہ ایثار و ملک کے لئے قربانی کا اندازہ اسکی اس بات سے لگایا جا سکتا ہے جو اپنے بیٹے کے بارے میں صوفیہ سے کہتی ہے:

''میرا لڑکا قومی فلاح و بہبود کے لئے کام کر رہا ہے اور تم سے سچ کہتی ہوں کہ اگر کوئی موقع آپڑے کہ قوم کی بھلائی کے لئے اسکو جان دینا پڑے تو مجھے ذرا بھی رنج نہ ہوگا رنج تب ہوگا جب ہم اسے دولت و ثروت کے سامنے سر جھکاتے یا فرض سے پیچھے قدم رکھتے دیکھونگی''[1]

جانہوی کے کردار میں سب سے اہم بات اسکی یہی ہمت و جراعت اور ملک و قوم کے لئے قربانی کا جذبہ ہے۔ جسکا اظہار بار بار پریم چند نے مختلف موقعوں پر کیا ہے، صوفیہ سے بات کرتے وقت یا اس وقت جب وہ وتے سے خفا ہوتی ہے اور اسے خط کے ذریعہ تنبیہ کرتی ہے کہ اسنے اسکی توقعات و آرزوؤں کو پورا نہیں کیا، اسکی ہمت و استقلال کا زبردست مظاہرہ وتے کی موت کے بعد ہوتا ہے، وہ صوفیہ کو وتے کی موت پر آنسو بہاتے ہوئے دیکھ کر سمجھاتی ہے کہ ''بہادروں کی موت پر رویا نہیں جاتا بلکہ خوشی کا راگ گایا جاتا ہے'' وہ خود اپنے چہرے سے کسی قسم کا رنج و غم کا اظہار نہیں ہونے دیتی بلکہ وتے کے بہادرانہ موت کے بعد اسکا جوش اور بھی دونا ہو جاتا ہے وہ پہلے سے کہیں زیادہ مستعدی سے کام کرنے لگتی ہے عالم ضعیفی کی کاہلی شباب کی تیزی میں بدل جاتی ہے اور وہ کمر بستہ ہو کر سیوا سمیتی کے کاموں کو اپنے ہاتھوں میں لیکر اسکی رہنمائی کرتی ہے:

''جب اس نے میدان عمل میں قدم رکھا اور اتنے جوش سے کام کرنے لگی کی سمیتی کو جو فروغ کبھی حاصل نہ ہوا تھا وہ اب ہوا

Scanned by CamScanner

> روپیہ کبھی اتنا زیادہ نہ تھا اور نہ کبھی ولنٹروں کی تعداد ہی اتنی زیادہ تھی، خدمتی دائرہ کبھی اتنا وسیع نہ تھا ان کے پاس جتنی ذاتی دولت تھی وہ سب سمیتی کو وقف کردی .....اس نے یہ دکھا دیا کہ موقع پڑنے پر عورتیں کتنا کام کرسکتی ہیں''[1]

اس طرح رانی جانہوی اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کے بعد پانڈے پور کی تحریک اپنے ہاتھ میں لیکر قومی خدمات انجام دیتی ہے، یہی نہیں بلکہ وتے کہ موت کی خبر سنکر ضبط وایثار کی یہ دیوی جب مجمع میں پہونچتی ہے تو فخر آمیز نگاہوں سے اسکی لاش کو دیکھ کر نوجوانوں سے کہتی ہے:

> ''رانی نے وتے کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اسکا بوسہ دیا اور مجمع کی طرف فخر آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولی نوجوانوں سے میں کہوں گی کہ جاؤ اور وتے کی طرح قربان ہونا سیکھو، دنیا صرف پیٹ پالنے کی جگہ نہیں ہے ملک کی آنکھیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں تمہیں اس کا بیڑا پار لگاؤ۔''[2]

رانی جانہوی کا کردار بھی بہت اہم کردار ہے کیونکہ ہماری آزادی کی تاریخ اس طرح کی حقیقی کرداروں اور تذکروں سے خالی نہیں ہے، اگر ہم ۱۹۱۹ء کے بعد ہندوستان کی جدوجہد آزادی پر نظر رکھیں تو ہمیں ضبط اور ایثار کی ایسی سیکڑوں دیویاں نظر آئیں گی جنہوں نے رانی کی طرح اپنے سپوتوں کو آزادی کے نام پر قربان کردیا ہے۔

پریم چند نے اپنے خیالات کو بڑی خوبی کے ساتھ رانی جانہوی کے ذریعہ ظاہر کیا ہے اس وقت ہندو مسلم اتحاد کی بھی سخت ضرورت تھی، پریم چند اس سے بخوبی

Scanned by CamScanner

واقف تھے وہ مانتے تھے کہ اگر ان میں آپس میں اختلاف ہوگا تو ملک کو آزادی حاصل کرنا دشوار ہو جائے گا اس کے لئے وہ رانی جانوی سے اتنی بڑی قربانی دلانے کے بعد ہندو اور مسلمانوں کی اتحاد کی ضرورت پر بھی اسکے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔

چوگان ہستی کا ایک اور اہم کردار صوفیہ کا ہے۔ جو کہ ہر اعتبار سے ایک دلکش کردار ہے اس میں حب الوطنی بھی ہے اور عوامی تحریک میں حصہ لینے کا جذبہ بھی ہے اس وقت ملک میں سیاسی تحریکات کی وجہ سے عام بیداری پھیل رہی تھی۔ عوام آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے آزادی نسواں کی جدوجہد زور پکڑتی جارہی تھی۔

صوفیہ کے کردار کے بارے میں خود پریم چند نے ''اقبال اور ماتحر'' کے نام خط میں لکھا ہے کہ ''صوفیہ کا کردار انہوں نے ''مسز اینی بسنت'' سے لیا ہے [1] یہی وجہ ہے کہ بہت سی باتیں جو مسز اینی بسنت کے کردار میں ملتی ہیں وہ صوفیہ کے کردار میں بھی نظر آتی ہیں، مسز اینی بسنت نے اپنی سوسائٹی ''ہوم رول لیگ'' کے ذریعہ ایک آفاقی مسئلہ کو اٹھانے کی کوشش کی تھی وہ ہر مذہب کی اچھائیوں کو تسلیم کرتی تھی، وہ تحریک آزادی اور سماجی اصلاح کی ایک اہم رکن کی حیثیت سے کام کر رہی تھیں، یہ ساری باتیں ہمیں کسی نہ کسی حد تک صوفیہ کے کردار میں ملتی ہیں، اس نے وتے کے ساتھ عوامی جدوجہد میں حصہ لیا اسکا سبب صرف وتے کے ساتھ اسکی محبت نہیں تھی بلکہ اسکا ثبوت صوفیہ کے اس گفتگو سے ہوتا ہے جو ڈاکوؤں کی قید میں اسنے کہی تھی، اس وقت جب ڈاکو کلارک کے بنگلے سے صوفیہ کو اٹھا کر لے جاتے ہیں تاکہ آزادی کے مجاہد رہنماؤں کو آزاد کرا سکے اور صوفیہ کی قیمت پر اپنے مطالبات منوا سکیں یہ لوگ صرف ڈاکو نہیں تھے بلکہ سامراج پرست راجاؤں کے خلاف بغاوت میں شریک

Scanned by CamScanner

تھے اور عوام پر ہو رہے ظلم و تشدد کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے۔ صوفیہ کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وتے سرکار سے مل گیا ہے اور ریاست کی عوام پر ہو رہے ظلم و تشدد میں برابر کا شریک ہے تو اسے بہت صدمہ پہونچتا ہے اور وتے جب صوفیہ تک پہونچتا ہے تو جن الفاظ میں وہ اسکا استقبال کرتی ہے اس سے صوفیہ کی سیاسی سوجھ بوجھ کا اندازہ ہوتا ہے وہ وتے سے کہتی ہے:

> ''آپ میرے نجات دہندہ ہیں مجھے ان ڈاکوؤں اور ظالموں کے پنجے سے چھڑا رہے ہیں آپ کا خیر مقدم کیسے نہ کروں، میرے لئے آپنے ریاست میں اندھیر مچا دیا سیکڑوں بے گناہوں کا خون کر دیا..... سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے ضمیر کے اصولوں کا ستیاناس کر دیا، اتنی نیک نامیاں پیدا کرنے پر بھی آپ کی تعظیم نہ کروں؟''[1]

یہاں پر صوفیہ کے الفاظ اسکی حب الوطنی خلوص اور عوام سے محبت کی نشاندہی کرتے ہیں وہ وتے سے محبت ضرور کرتی ہے لیکن یہ نہیں چاہتی تھی کہ صرف ذاتی مفاد کی خاطر عوامی تحریک اور باغیوں کو کچل دیا جائے اسلئے وہ تلخ انداز میں کہتی ہے کہ میں نے تمھیں اپنا محبوب اس لئے بنایا تھا کہ تمھاری زندگی کا معیار بلند تھا وطن سے تمھارے پیار اور ہمدردی نے میرے دل میں تمھاری عزت اور محبت پیدا کی تھی لیکن تمھاری اصلیت ظاہر ہوگئی تم نے بھلائی اور برائی میں کوئی فرق نہیں پایا آج اگر تم حکومت کے ہاتھوں ظلم اور رسوائی کی تکلیفیں اٹھا کر آئے ہوتے تو میں تمہارے قدموں کی خاک اپنی پیشانی پر لگاتی۔

نہ صرف یہ کہ صوفیہ وتے کو برا کہتی ہے بلکہ باغیوں میں شامل ہو جانے کا اعلان کرتی ہے جو کہ اسکے کردار میں حب الوطنی عوام سے محبت اور ظلم و نا انصافی کے خلاف

Scanned by CamScanner

بغاوت کا اظہار کرتا ہے وہ کہتی ہے:

''ان گنہگاروں سے خون کا انتقام لوں گی جنہوں نے
رعایا کی گردنوں پر چھریاں پھیریں ایک ایک کو دوزخ کی آگ میں
بھون دونگی جب ہی میرے دل کو تسکین ہوگی خواہ اس کام میں مجھے
جان سے ہاتھ دھونا پڑے خواہ ریاست میں انقلاب کیوں نہ رونما ہو
جائے خواہ ریاست کا نشان ہی کیوں نہ مٹ جائے۔''[1]

صوفیہ پورے ناول میں سیاسی تحریک میں حصہ لینے والی ایک بیباک نڈر اور غیانہ مزاج رکھنے والی عورت کے روپ میں سامنے آتی ہے جو اس عہد میں عورتوں کے درمیان پھیلی قومی بیداری کو ظاہر کرتی ہے، اسکے علاوہ ناول میں بہت سے ایسے کردار ہیں جو اپنے اپنے طبقہ کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ بعض انفرادی خوبیوں سے اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں نائک رام بھیرو۔ بجرنگی۔ جمنی۔ ٹھاکر بین۔ سوبھاگی۔ جگدھر مستری وغیرہ۔ یہ سبھی محنت کش غریب مزدور لوگ ہیں جس سے ناول میں اسکی زندگی اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر روشنی پڑتی ہے اسکی نمائندگی سوردا س کرتا ہے، جان سیوک اور پربھو سیوک کے ذریعہ سرمایہ داروں کی ذہنیت اور دولت کی ہوس کو دکھایا گیا ہے، مسٹر کلارک اور براؤن کے ذریعہ انگریزی حکومت اور راسکے حکام کی عیش پرستی اور ہندوستانیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک وظلم و جبر وغیرہ سامنے اتا ہے، راجہ بھرت سنگھ اور مہندر کمار سنگھ جاگیردار طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں، ان کرداروں کے ساتھ ساتھ ملک کی ریاستوں کے کردار بھی نمایاں کئے گئے ہیں اور انھیں لوگوں کے درمیان قومی تحریک کی بنیاد پڑ رہی تھی جنہیں ناول میں پریم چند نے عوام کے خیالات کے ذریعہ بیدار ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔

---

[1] پریم چند۔ چوگان ہستی، جلد دوم، ص 97

Scanned by CamScanner

''جولوگ کاہل اور بے پرواہ سے ہورہے تھے پھر نئے
جوش سے کام کرنے لگے مگر سیوا سمیتی کے عموماً سبھی لوگ تعلیم یافتہ
تھے.....اس جماعت کا کام صرف سوشل تھا''[1]

اس تحریک کے روح رواں پربھوسیوک اور ڈاکٹر گنگولی جیسے کردار بھی تھے جو قومی بیداروں کی تحریک کو بخوبی انجام دے رہے تھے کونسل ہاؤس میں بحث کے دوران مسٹر کلارک کی زیاتیوں کے خلاف وہ گورنمنٹ کو آمادہ نہ کر سکے برعکس مسٹر کلارک کو ترقی دیدی گئی تو وہ سرکاری برائیوں کا پردہ فاش کرتے ہیں تو کونسل ہاؤس کی خلاف ورزی کے جرم میں انھیں باہر جانے کا حکم دیدیا جاتا ہے ڈاکٹر گنگو کے خیالات کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

'' آپ ہمیں حیوانی طاقت سے خاموش کرنا چاہتے
ہیں اسلئے کہ آپ میں جواز اور انصاف کی کی قوت نہیں ہے.....
اب ہمیں صاف نظر آرہا ہے کہ کہ ہم کو پیل کر تیل لگانے کے لئے
ہماری ہستی مٹانے کیلئے ہماری تہذیب وانسانیت کا خون کرنے کے
لئے ہم کو غیر محدود زمانہ تک چکی کا بیل بنائے رکھنے کیلئے ہم پر حکومت
کیجارہی ہے.....مگر اب معلوم ہوگیا کہ مقصد سب کا ایک ہے صرف
حصول کے ذرائع میں فرق ہے'' [2]

اس کے بعد ڈاکٹر گنگولی استعفیٰ دیکر کنور بھرت سنگھ کے ساتھ مل کر ملک وقوم کی خدمت میں لگ جاتے ہیں اور سمیتی کے کاموں کو آگے بڑھاتے ہیں اسکے علاوہ دوسرے کردار بھی ہیں جو تشدد کے ذریعہ جدوجہد کر کے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں، بیر پال سنگھ اس کا بہترین نمائندہ ہے جو اس وقت کی جارحانہ قوم پرستی کی نمائندگی کرتا ہے۔

Scanned by CamScanner

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند نے چوگان ہستی میں پانڈے پور گاؤں کے حوالے سے ہندوستا کے ماحول کو پیش کرتے ہوئے پوری جدو جہد آزادی کی تحریک کو اس ناول کے دامن میں سمیٹ لیا ہے، جو کہ عدم تشدد اور ستیہ گرہ کے ذریعہ اس وقت لڑی جارہی تھی، سوردآس کے ذریعہ جدو جہد آزادی کی پوری فضا سامنے آجاتی ہے جو اس وقت موجود تھی۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس [1]

> ''واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی قومی زندگی کے جتنے مسائل اور خود انکی جتنی وسیع تصویر اس ناول میں ہے وہ گئودان کے علاوہ کسی اور ناول میں نہیں ملتی ہے''

☆☆☆

Scanned by CamScanner

مضامین

مولوی سیّد ظفر حسن گلدستۂ مضامین میں لکھتے ہیں کہ:

''جب کوئی کچھ کہنا چاہتا ہے تو اس کے ذہن و دل میں کوئی بات آتی ہے۔ یہی اس کا خیال ہے۔ اسی کو مضمون کہا جاتا ہے۔ اس خیال و مضمون کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ الفاظ ہیں''۔ یعنی ذہن و دل میں جب خیالات، احساسات اور جذبات آلیتے ہیں۔ اس کے بعد الفاظ کی تلاش ہوتی ہے۔ خیالات کا اثر دیرپا ہوتا ہے اور الفاظ کا وقتی۔ اسی لئے زیادہ زور اور توجہ خیالات کی اصلاح اور پاکیزگی کی طرف دینا چاہئے۔ لیکن یہ بات نہ بھول جانا چاہئے کہ خیالات اور الفاظ لازم و ملزوم ہیں۔ یہ بات بھی مناسب اور پسندیدہ نہیں کہ خیالات عمدہ اور بلند ہوں اور ان کو ادنیٰ اور پست یا غلط اور بھونڈے لفظوں میں بیان کریں۔ اسی طرح یہ بات بھی بری ہے کہ ساری توجہ اور لیاقت لفظوں کی تلاش اور انتخاب کی طرف کردی جائے اور خیالات کی طرف کم توجہ کی جائے۔ ایسا کرنے سے خیالات اور الفاظ میں مطلوبہ اور پسندیدہ تعلق اور تناسب نہیں رہ جاتا اور مضمون کی حیثیت گر جاتی ہے اور اس میں نقص پیدا ہوتا ہے۔

پریم چند شروع سے ہی اس بات پر زور دیتے آئے ہیں کہ

مضمون نویس کے لئے ضروری ہے کہ جہاں تک ہو سکے وہ اپنے مضمون کو انتہائی خاموشی، اطمینان اور سکون کی حالت میں لکھے تاکہ جس ترتیب سے اس نے اپنے خیالات کو اپنے ذہن میں قائم کیا ہے وہ اسی ترتیب سے قائم رہیں اور ان میں کسی قسم کا خلل نہ پڑے۔ اگر کسی وجہ سے خیالات میں اور خیالات کی ترتیب میں خلل واقع ہو جاتا ہے تو ذہن سے باتیں نکل جاتی ہیں اور سوچنے سے بھی ذہن میں نہیں آتے بلکہ وہ جتنا زیادہ سوچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی الجھن اور بھی زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ اس لئے مضمون لکھنے کے لئے یکسوئی کا ہونا ضروری ہے۔ انھوں نے ماہنامہ زمانہ میں لکھا ہے کہ مضمون نگار حتی الامکان اس بات کی کوشش کرے کہ مضمون لکھتے وقت ان کا دماغ افکار یا کسی قسم کے تکان سے خالی ہو یا جب لکھنے کے درمیان دماغ پر کسی قسم کی تکان کا احساس ہونے لگے تو وہ تھوڑی دیر کے لئے مضمون لکھنا بند کردے۔ تھکا ہوا دماغ مضمون

Scanned by CamScanner

میں ہمواری نہیں قائم رکھ سکتا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مضمون لکھنے کے وقت پہلی ضرورت جو قابل توجہ ہونے چاہئے یہ ہے کہ جو جو خیال آپ کے مضمون کے بارے میں آتا جائے اس کو آپ نوٹ کرتے جائیں۔ پھر غور و فکر کریں۔ ان کو مناسب ترتیب دے لیجئے۔ مضمون کے خیالات کی ترتیب خصوصاً اس کا ابتدائی جملہ یا جملے ایسے ہوں کہ پڑھنے والا یا سننے والا سمجھ لے کہ آپ کیا لکھنے جا رہے ہیں۔ یہ جو الفاظ استعمال کئے جائیں وہ لغت اور صرف و نحو کے موافق ہوں۔ ان کا تلفظ کا ادا کرنا آسان ہو۔ ان کا سمجھنا دشوار نہ ہو۔ ان میں تعقید یعنی پیچیدگی نہ ہو جس طرح عمدہ اور لذیذ کھانے خوب صورت اور موزوں برتنوں میں نکالنے سے ان کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح خیالات کو عمدہ لفظوں میں بیان کرنے میں ان خیالات کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اس لئے عمدہ لفظوں کی تلاش و انتخاب ضروری ہے۔ لفظوں کو آسان سلیس، قریب الفہم ہونا چاہئے۔ ثقیل، بھونڈے نامانوس، پیچیدہ، مشکل لفظوں کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اسی طرح غیر زبانوں کے لفظوں کا استعمال بھی حتیٰ الامکان نہ کرنا چاہئے کیوں کہ ایسا کرنے سے مضمون میں ابہام پیچیدگی اور نامانوسیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس سے مضمون میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نامانوس، پیچیدہ ترکیبوں کے استعمال سے بھی بچنا چاہئے۔ یہ بات بھی عمدہ مضمون کے حق میں مفر ہے۔

پریم چند نے اکثر اپنے اداریوں میں لکھا ہے کہ مضمون نگار یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ طویل اور پیچیدہ جملوں سے بھی مضمون میں ابہام اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور مضمون کی وضاحت میں کمی اور نقص آ جاتا ہے اس لئے جہاں تک ہو سکے جملے چھوٹے استعمال کرنا چاہئے۔ بہر صورت اس بات کا لحاظ ہو کہ مضمون میں پیچیدگی اور ابہام نہ پیدا ہو بلکہ اس کے معنی و مفہوم واضح اور صاف ہوں جو پورے طور پر سمجھ میں آ جائیں۔

پریم چند کے مشہور مضامین درج ذیل ہیں:

۱۔	آلیور کرومویل	آوازِ خلق	۱۹۰۳ء
۲۔	ڈرامہ جنگ روس و جاپان	زمانہ	فروری ۱۹۰۶ء
۳۔	وکرم اروشی کا اردو ترجمہ	"	فروری ۱۹۰۸ء
۴۔	سوامی ویویکانند	"	مئی ۱۹۰۸ء

Scanned by CamScanner

۵۔	رینالڈس اوراس کی مصوّری	زمانہ	جنوری ۱۹۰۹ء
۶۔	زلیخا (مثنوی)	"	اکتوبر ۱۹۰۹ء
۷۔	گالیاں	"	دسمبر ۱۹۰۹ء
۸۔	ہندوستانی مصوّری	"	اکتوبر ۱۹۱۰ء
۹۔	ہندو فن حکمت	"	مارچ ۱۹۱۲ء
۱۰۔	قیس (مثنوی)	"	جنوری ۱۹۱۳ء
۱۱۔	قدیم ہندو علم ریاضی	"	جون ۱۹۱۷ء
۱۲۔	کلام اکبر پر ایک نظر	"	جنوری ۱۹۰۹ء
۱۳۔	ناول کا فن	مادھوری	اکتوبر ۱۹۲۲ء
۱۴۔	ناول کا موضوع	سالیہ	جنوری ۱۹۲۵ء
۱۵۔	مختصر افسانہ	کلیاتِ پریم چند	
۱۶۔	مختصر افسانہ کا فن	"	
۱۷۔	ادب کی غرض و غایت	زمانہ	اپریل ۱۹۳۶ء
۱۸۔	سودیشی تحریک	"	۱۹۰۵ء
۲۰۔	اسلامی تہذیب کے بارے میں	"	دسمبر ۱۹۲۵ء

پریم چند کے ادبی کیریئر کا آغاز اور ان کی شہرت بحیثیت مضمون نگار کے ہوئی ۱۹۰۴ء تک ان کا کوئی افسانہ نہیں چھپا تھا (اس لئے کہ انھوں نے ابھی افسانہ لکھنا ہی شروع نہیں کیا تھا)، حالانکہ اسی سال کے جنوری فروری کے شمارہ، زمانہ، (کانپور) میں ان کا ایک معرکتہ الآرا مضمون ''ہم دیسی اشیاء کو کیوں کر فروغ دے سکتے ہیں'' چھپا۔ ۱۹۰۵ء میں زمانہ (کانپور) میں ان کے پانچ مضامین یکے دیگر چھپے اُن میں سے چار سوانحی اور ایک خالص ادبی اور تنقیدی تھا۔ (''صلح کل''، ''حکیم برہم کے ناول''، ''کرشن کنور'')۔ ان مضامین کے مقابلے میں اگر چہ ان کا ایک ناول ''اسرار محبت'' بنارس کے ایک غیر معروف ہفتہ وار ''آواز خلق'' میں اکتوبر ۱۹۰۳ء سے ہفتہ وار چھپنے لگا تھا (یہ ناول اکتوبر ۱۹۰۵ء میں پورا ہوا) لیکن اُن کے افسانوں کا

Scanned by CamScanner

پہلا مجموعہ ''سوزِ وطن'' ان کی مضمون نگاری کے تین چار سال بعد ۱۹۰۸ء میں چھپا، جس کا پہلا افسانہ ''عشق دُنیا اور حبِ وطن ۱۹۰۷ء میں زمانہ میں شائع ہوا تھا اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ان کے سالِ انتقال کی بھی سب سے اہم تحریر ایک مضمون ہی تھا، یعنی ان کا وہ خطبہ صدارت جس نے ترقی پسند ادب کی جڑیں مضبوط کیں اور اس کے فروغ میں سنگِ میل ثابت ہوا۔ ان کا آخری ناول ''گؤدان'' اگر چہ اس مضمون سے پہلے لکھا جا چکا تھا لیکن اُردو پڑھنے والوں کے سامنے یہ ناول خطبۂ صدارت کے بعد ہی آیا۔ پریم چند نے فکشن میں قوت اظہار کے موضوع پر ایک خالص نظریاتی مضمون ''ہماری قوت بیانیہ کا زوال'' لکھا تھا۔ اپنے نقطۂ نظر کے اظہار کے سلسلے میں انھوں نے عجیب و غریب طریق استدلال اختیار کیا۔ عہد گزشتہ کی داستانوں ناولوں (بالخصوص تاریخی ناولوں) اور افسانوں کے حوالہ سے انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ جب تک لکھنے والا کسی بات یا واقعہ یا حادثہ یا ماحول سے براہ راست واقف نہ ہو اس کے یہاں اظہار کی قوت بناوٹی اور مصنوعی رہے گی۔ دوسرا استدلال وہ زور بیان کی کمزوری عربی اور فارسی زبانوں کی تعلیم سے بیگانگی اور کنارہ کشی میں تلاش کرتے ہیں (ظاہر ہے کہ پریم چند نے یہاں اردو فکشن کو سامنے رکھا ہے) اس مضمون میں انھوں نے جس مخصوص ماحول کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ وہ ماحول تھا جس کی نمائندگی ان دنوں فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام مرتبہ داستانی ادب نئی کہانیوں میں رواج دیا جارہا تھا۔ وہ سارا ماحول جس کے زوال میں پریم چند نے جدید افسانوی ادب کی کمزور قوت بیانیہ کو حوالہ بنادیا ہے وہ اس مضمون کی خارجی سطح ہے۔ چنانچہ سرسری طور پر پڑھنے میں تو یہ مضمون محض قدیم شاہی درباروں کی فضا کے طمطراق کے مٹ جانے کا ''اندوہناک'' مرثیہ بنتا ہے۔ جب کہ فی الواقع وہ اس حوالے سے جس امر کی وکالت کرتے ہیں وہ لکھنے والے کو اپنے ماحول کو جذب کرنے اور براہ راست اس کا حکیمانہ شعور رکھنا ہے۔ دوسری اہم بات وہ یہ بھی سمجھاتے نظر آتے ہیں کہ آج کے دور میں گزرے ہوئے دنوں کی اس فضا کو جدید افسانہ نگاری کی بنیاد بنانا بے وقت کی راگنی ہے کہ جواب فسانہ پارینہ بھی ہے اور وقت کے تقاضوں کا جواب بھی نہیں ہے۔ اس کا مطلب صاف صاف لفظوں میں یہ ہے کہ وہ عصر حاضر کے شعور کی روش اور تقاضوں کے تحت ذاتی تجربہ کو ابلاغ مدعا کے لئے بنیادی ضرورت سمجھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے اس ادبی رویے کی بنیاد مجرّد نوعیت کے اخلاقی ضابطوں کی گرفت کے ڈھیلے پڑ جانے کے غم پر نہیں ہے بلکہ وہ دراصل عوام کے ''علم و عمل تہذیب و معاشرت اور جذبات اور محسوسات'' کو بھی ادیب

Scanned by CamScanner

کے مطالعے اور مشاہدے کے لئے بنیادی شرط سمجھتے ہیں۔ ان کے مضامین ''اردو زبان اور ناول''۔ ''مختصر افسانہ'' ''اور مختصر افسانوں کا فن''، ''ناول کا موضوع''، ''راشد الخیری کے سوشل افسانے'' پریم چند کے نظریات فکر وفن کو سمجھنے کے لئے بے حد اہم ہیں۔ ان مضامین سے دو ایک اقتباسات دیکھئے:

''ادب کا سب سے اُونچا آورش یہ ہے کہ اس کی تخلیق فن کی تکمیل کے لئے کی جائے۔ فن برائے فن کے اصول سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا لیکن وہی ادب قابلِ قدر ہوسکتا ہے جس کی بنیاد انسانی فطرت کے مظاہر پر رکھی جائے۔ محبت اور رقابت، غصہ اور حرص، عقیدت اور نفرت، تکلیف اور آسائش یہ سب ہماری مختلف ذہنی حالتیں ہیں۔ ان کی جھلکیاں دکھانا ادب کا بنیادی مقصد ہے اور بغیر مقصد کے تو کوئی ادبی تخلیق ہو ہی نہیں سکتی''۔

''یہ بہت مشکل ہے کہ ادیب (ان) حالات سے متاثر نہ ہو۔ ان سے دو چار ہو کر اس کے اندر کوئی ردِ عمل پیدا نہ ہو۔ یہی سبب ہے کہ آجکل ہندوستان ہی کے نہیں یوروپ کے بڑے بڑے ادیب اور عالم بھی اپنی تخلیقات کے ذریعے کسی نہ کسی ازم کی اشاعت کر رہے ہیں۔ وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ اس سے ہماری تخلیق زندہ رہے گی یا نہیں۔ اپنے عقائد کا اظہار اور ان کا تحفظ ہی ان کا نصب العین ہے۔ اس کے علاوہ ان کی اور کوئی خواہش نہیں.....''

''ہم سمجھتے ہیں کہ کیوں نہ ایک باشعور ادیب اپنی تخلیقات میں اپنے عقائد کا اظہار ایسی خوبصورتی سے کرے کہ ان میں انسان کے جذبات اور خیالات کی کشمکش بھی منعکس ہوتی رہے۔ ''ادب برائے ادب'' کا وقت وہ ہوتا ہے جب ملک میں آسودگی اور خوش حالی ہو۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہم مختلف قسم کے سماجی بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں، جدھر نگاہ اٹھتی ہے دکھوں اور تکلیفوں کے بھیانک منظر سامنے نظر آتے ہیں۔ ستم زدوں کی آہ و بکا سنائی دیتی ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ کسی حساس انسان کا دل نہ دہل اٹھے.....''

یہ تینوں اقتباسات پریم چند کے ایک ہی مضمون ''ناول کا فن'' سے لئے گئے ہیں۔ ان اقتباسات میں ادب برائے ادب، فن برائے فن کے مقابل ادب اور فن برائے مقصد کے بارے میں پریم چند نے جس طرح سے کھل کر باتیں کہی ہیں وہ ان کے ادبی رویے اور نظریات میں شدت ایقان واعتماد کی

Scanned by CamScanner

واضح دلیل ہیں۔ پریم چند کے تخلیقی رویوں اور تنقیدی رویوں میں اعتقادات کی یہ نوعیت ان کے ہمعصر لکھنے والوں کے مقابلے میں لفظاً نہیں معناً منفرد اور یکتا ہے۔ یہ وہ دور تھا (یعنی بیسویں صدی کی تیسری دہائی) کہ جب ہمارا ادب اور شاعری۔ وفور جذبات و جذباتیت اور رومانوی بھنور سے باہر نکلنے کے لیے سوچ بھی نہیں پا رہا تھا۔ نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری، لطیف الدین احمد، اکبر آبادی اور اوپندر ناتھ اشک ابھی تک ابوالکلام آزاد، مہدی افادی اور سجاد حیدر یلدرم کی رنگینی خیال و بیان کے طلسم میں اسیر تھے۔ ان لکھنے والوں میں سے کم از کم مولانا آزاد اور نیاز فتحپوری تو نہایت ثقہ، ثقیل اور کھڑی علمیت کے علم برداروں میں تھے لیکن ان کے یہاں بھی رومانیت کا وفور ادبی اسلوب اور علمی مباحث پر پورے طور پر حاوی تھا۔

تیسری دہائی میں ابھر کر سامنے آنے والے ادیبوں میں پریم چند وہ واحد ادیب ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اور بہت جلد اس رومانوی طلسم سے اپنی تحریروں کو آزاد کرالیا تھا۔ ان کے ابتدائی افسانے جو پہلے مجموعہ سوز وطن ۱۹۰۸ء میں شامل تھے۔ داستانی طرز کے تھے اور اسلوب کے اعتبار سے پریم چالیسی میں بھی اکثر ان کے یہاں یہی طرز بیان جاری رہا لیکن نقطہ نظر کا فرق پریم چند کے ہاں شروع ہی سے ملتا ہے۔ ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری بلاشبہ اپنے دور کے اوہام اور عقائد کی اندھی پیروی میں متشددانہ جذباتیت کو لگام دینے والے اولین ادیب با اجتہاد تھے، لیکن موضوعات کے برتنے میں ان کا ادبی روّیہ خود اپنی جگہ اس درجہ رومانوی تھا کہ مدتوں فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا جو بعد کے آنے والے قارئین نے اُٹھایا اور کہیں چوتھی دہائی کے وسط تک ممکن ہو سکا۔

پریم چند کی یہ خوش نصیبی تھی کہ انھوں نے اپنے قارئین کو متاثر کرنے اور اپنے بعد آنے والے افسانہ نگار اور ناول نویسوں بالخصوص علی عباس حسینی، پنڈت بدری ناتھ، سدرشن اور اوپندر ناتھ اشک کو اپنی ڈگر پر ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کامیابی کا دارومدار اس بات میں پوشیدہ تھا کہ پریم چند نے اپنے عصری تقاضوں کو سمجھنے اور ان کا چیلنج قبول کرنے میں اپنے ہمعصروں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام تب ہی ممکن ہو سکتا ہے کہ لکھنے والے کے اندر روح عصر تک پہنچنے کی بصیرت موجود ہو اور وہ اس سے صحیح وقت پر کام بھی لے سکتا ہو۔ پریم چند نے اپنے فکری، تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتوں کا بیک وقت مظاہرہ کر کے ان سب خوبیوں کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

Scanned by CamScanner

پریم چند کے ان مضامین میں سنسکرت، فارسی، ہندی اور اردو شاعری اور شعرا پر بھی مضامین ہیں اور ناول اور افسانے کے فن اور موضوعات پر بھی، مصوری پر بھی، ڈرامہ اور سوانح پر بھی اور کتابوں پر تبصرے بھی، مضامین کی یہ مختلف النوع کیفیت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ پریم چند نہ صرف کثیر المطامعہ ادیب تھے بلکہ اپنے عہد کے جملہ رجحانات اور تقاضوں سے پوری طرح باخبر اور ان سے ہم آہنگ بھی تھے۔

Scanned by CamScanner

منشی پریم چند کا سوانحی خاکہ

منشی پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ وہ ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء کو ضلع وارانسی مڑھوا کے "لمہی" نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نے آپ کا نام دھنپت رائے رکھا جب کہ آپ کے چچا نے آپ کا نام پریم چند رکھا۔ ۱۸۸۵ء میں لال پور کے مولوی صاحب کے پاس اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۵ء میں گورکھپور سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں معلم کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی اور اکیاسی روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ بعد ازاں ۱۸۹۹ء میں بنارس میں اسسٹنٹ ٹیچر کی نوکری مل گئی۔ ۱۹۰۰ء میں بہرائچ کے گورنمنٹ اسکول میں تقرر ہوا اور پھر پرتاب گڑھ کے ضلع میں تبادلہ ہوا۔ الہ آباد میں جا کر آپ نے پہلی مرتبہ سنجیدگی سے لکھنا شروع کیا۔

۱۹۰۴ء میں جونیئر انگلش ٹیچر کا امتحان پاس کیا اور اسی سال الہ آباد یونیورسٹی سے اردو ہندی کا خصوصی امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۶ء میں آپ کی شادی ایک بیوہ "شیورانی دیوی" سے ہوئی۔ ۱۹۰۹ء میں ترقی پا کر سب انسپکٹر آف اسکولز ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں بی۔اے کیا۔ فروری ۱۹۱۲ء میں عدم تعاون کی تحریک کے سلسلے میں ملازمت سے علاحدگی اختیار کر لی۔ اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں پہلی مرتبہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی صدارت کی۔ ۱۸/اکتوبر ۱۹۳۸ء کو ۵۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔

پریم چند نے ۱۹۰۰ء کے آس پاس لکھنا شروع کیا۔ اور اس طرح ۱۹۰۳ء میں آپ کا پہلا ناول 'اسرار معابد' منظر عام پر آیا۔ پھر ۱۹۰۴ء میں دوسرا ناول 'کشنا' کے نام سے لکھا اور اسی سال جونیئر انگلش ٹیچر کا امتحان پاس کر کے ہیڈ ماسٹر بنے۔ ۱۹۰۷ء میں پہلی کہانی "انمول رتن" لکھی۔ ۱۹۰۸ء میں سب ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں افسانوں کا دوسرا دور شروع ہوا اور تاریخی و اصلاحی کہانیاں لکھیں۔ ۱۹۲۰ء کے آس پاس تیسرا دور شروع ہوا، اصلاحی اور سیاسی کہانیاں لکھیں۔ ۱۹۲۱ء میں ملازمت چھوڑ دی۔ ۱۹۲۲ء

۱؎ افسانے کی حمایت اور ابتدا، ڈاکٹر سہیل بخاری، صحیفہ سہ ماہی جون، جولائی، اگست، مجلس ترقی ادب، لاہور

Scanned by CamScanner

میں رسالہ ''مریادا'' کی ادارت سنبھالی۔۱۹۲۵ء میں گنگا بنک مالا میں ملازمت کی۔۱۹۲۸ء میں ہندی رسالہ ''مادھوری'' کی ذمہ داری سنبھالی۔۱۹۳۰ء میں اپنا ذاتی پرچہ ''ھنس'' نکالا۔۱۹۳۲ء کا دور جسے ہم سیاسی اور فکری دور مانتے ہیں۔۱۸/اکتوبر ۱۹۳۶ء میں انتقال ہوا۔

افسانوں کے مجموعے

آپ کے افسانوی مجموعوں میں (۱) سوزِ وطن (۱۹۰۸ء)، (۲) پریم پچیسی اول (۱۹۱۵ء)، (۳) پریم پچیسی دوم (۱۹۱۸ء)، (۴) پریم بتیسی (۱۹۲۰ء)، (۵) خاکِ پروانہ (۱۹۲۰ء)، (۶) خواب و خیال (۱۹۲۸ء)، (۷) فردوسِ خیال (۱۹۲۹ء)، (۸) پریم چالیسی (۱۹۳۰ء)، (۹) آخری تحفہ (۱۹۳۴ء) اور (۱۰) زادِ راہ (۱۹۳۶ء) شامل ہیں۔

تعلیم کا آغاز

پریم چند کی تعلیم کا آغاز مولوی صاحب کے مدرسے سے ہوئی، مولوی صاحب کے دروازہ پر لڑکے جمع ہو جاتے اور اردو کی پڑھائی شروع ہو جاتی۔ سریواستو کائستھ ہونے کی وجہ سے اردو اور فارسی کا پڑھنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ پریم چند بچپن سے بلا کے ذہین تھے۔ ماں کے انتقال کے پانچ چھ ماہ بعد ان کے والد بیمار ہوئے۔ پریم چند ان کے ساتھ لمہی آئے، اس وقت مولوی صاحب کے پاس پڑھنا، گلی ڈنڈا کھیلنا، املی توڑ کر چوسنا اور مٹر کی پھلی توڑ کر کھانا، یہی ان کا کام تھا۔ گیارہ بارہ سال کی عمر میں دادی سے پریوں کی کہانیاں سنیں اور اسی عمر میں نئی ماں آئیں۔ جب ان کے والد کا تبادلہ گورکھپور ہوا تو مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ دادی کے انتقال کا صدمہ بھی برداشت کر چکے تھے۔ دادی کے ساتھ تمام پریاں جیسے آسمانوں کی طرف اُڑ گئی تھیں۔ ان پریوں کی تلاش میں تمباکو والے کی دوکان پر پہنچے اور یہاں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ مولوی صاحب کے مکتب سے بہانے بنا کر بھاگنے والا دھنپت اب کتابوں میں کھو گیا تھا۔ پتنگ اڑانے کی بڑی آرزو تھی لیکن ''پیسے پاس نہ تھے، وجے بہادر میں بالے میاں کے میدان کی اور (طرف) جاتے اور وہاں کنکوؤں کو دیکھتے رہتے جہاں کنکوؤں کی گری ڈور مل جاتی اور شوق پورا ہوتا۔ کون جانتا تھا کہ تمباکو والے کی دوکان میں کوئی دھنپت رائے پریم چند بن رہا ہے۔ پریم چند لکھتے ہیں:

''وہیں مجھے لکھنے کا بھی شوق ہوا''۔

Scanned by CamScanner

فراق گورکھپوری نے لکھا ہے:

''پریم چند نے خود مجھے بتایا تھا کہ لڑکپن میں ان کی دوستی اپنے درجہ کے ایک لڑکے سے ہوگئی جو ایک تمباکو فروش کا بیٹا تھا۔ روزانہ اپنے کم عمر دوست کے ساتھ اسکول کے بعد اس کے مکان پر جاتے۔ وہاں تمباکو کے بڑے بڑے سیاہ بنڈلوں کے پیچھے تمباکو فروش اور اس کے احباب بیٹھ کر برابر حقہ پیتے اور ''طلسم ہوش ربا'' کے افسانے سنتے، یہاں تک کہ شام ہو جاتی سب گھر چلے جاتے۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک سال جاری رہا لیکن اس اثنا میں پریم چند ہمیشہ کے لیے رومانی کہانیوں میں ڈوب گئے''۔[۱]

داستانی روایتوں کو ذہن کی زنبیل میں غیر شعوری طور پر بند کرتے رہے۔ داستانوں کے ساتھ ہی اردو ناولوں اور کہانیوں کو پڑھا۔ پندرہ سال کی عمر میں نویں جماعت میں تھے، اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ بنارس آئے۔ والد نے دریافت کیا خرچ کیا ہوگا، بڑی سادگی سے جواب دیا: ''پانچ روپے۔'' لیکن بنارس آنے کے بعد علم ہوا کہ اس سے زیادہ خرچ ہوگا۔ دن بھر شہر میں رہتے۔ رات کو گاؤں واپس آجاتے، کسی قسم کی کوئی مدد کہیں سے نہیں ملی۔ اپنی کتاب ''پریم چند اور ان کا یگ'' (ہندی) میں ڈاکٹر رام بلاس شرما نے غلط نہیں کہا ہے کہ:

''ان کے کردار میں اس وقت کے ہندوستان کے طالب علم کو دیکھا جا سکتا ہے''۔[۲]

یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی عمر میں زندگی کی بہت سی سچائیوں کا تجربہ ہوگیا تھا، اسی عمر میں ان کی پہلی شادی شریمتی شیورانی دیوی سے ہوئی۔ یعنی وہ ایک کھاتے پیتے زمیندار کے گھر سے دلہن لائے۔ شادی کے بعد ان کی زندگی میں کوئی توازن پیدا نہ ہوا بلکہ زندگی کی تلخیاں اور بڑھ گئیں۔ یہ شادی پریم چند کے لیے کوئی المیہ ہو یا نہ ہو ان کی بیوی کے لیے المیہ ضرور تھا۔ پریم چند کہتے ہیں:

''میری بارات آئی، میرے پتا کو معلوم ہوا کہ میری بیوی بہت بدصورت ہے۔ بے حیائی کی حرکت انھوں نے باہر ہی دیکھ لی تھی۔ میری شادی چاچی کے پتا نے ٹھیک کی تھی۔ پتا جی چاچی سے بولے ''لالہ جی نے میرے لڑکے کو کنویں میں ڈھکیل دیا۔

Scanned by CamScanner

افسوس، میرا گلاب سالڑکا اور اس کی ایسی بیوی میں تو اس کی دوسری شادی کروں گا''۔[۱]

جب ان کے والد کا تبادلہ لکھنؤ ہوا تو وہ اس وقت نویں کلاس میں مڈھواں میں تھے۔ والد نے سبھوں کو مڈھواں پہنچا دیا۔ شادی کے بعد گھریلو زندگی کی گرفت کافی مضبوط ہوگئی تھی۔ ایک رومانی ذہن کے لیے یہ گرفت معمولی نہ تھی۔ معاشی پریشانیوں کا گہرا احساس اسی دور میں ہوا۔ گھر میں سکون نہ تھا۔ ایک طرف گھر چلانے کی فکر اور دوسری طرف گھر کی بوجھل فضا جہاں ان کی چاچی ان کی بیوی پر حکومت کر رہی تھیں۔ دونوں میں آئے دن جھگڑے ہوتے۔ اس تلخ زندگی کے متعلق پریم چند کہتے ہیں:

''چاچی میری بیوی پر حکومت کرتی تھی۔ اس کی شکایت بھی چاچی اکیلے میں مجھ سے کیا کرتی تھیں۔ وہ بھی اپنی قسمت کو روتی تھی۔ بیچ میں میری آفت تھی''۔[۲]

آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد والد کا انتقال ہوگیا۔ ایک اور بڑا گہرا زخم ملا اور بے ضابطگی کے سائے گہرے ہوگئے۔ ان کا ایک خواب تھا۔ ایم اے پاس کر کے وکیل بننے کا، لیکن یہ خواب بھی پگھلنے لگا، اس خواب کو سنبھالنا چاہتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''گھر میں میری بیوی، سوتیلی ماں اور ان کے دو لڑکے تھے مگر آمدنی ایک پیسہ کی نہ تھی۔ گھر میں جو کچھ تھا چھ ماہ تک والدہ کی علالت اور ان کی تجہیز و تکفین میں خرچ ہوگیا، مجھے ایم اے پاس کر کے وکیل بننے کا ارمان تھا۔ ملازمت اس زمانے میں اتنی ہی مشکل سے ملتی تھی جتنی کہ اب۔ دوڑ دھوپ کر کے دس بارہ روپے کی جگہ پا جاتا مگر یہاں تو آگے پڑھنے کی دھن تھی''۔[۳]

شعور کی شکست بار بار ہو رہی تھی لہٰذا تشنگی اور بڑھتی جا رہی تھی۔ ۱۹۰۴ء میں ''پرمانٹ جونیئر انگلش ٹیچرس'' کا امتحان ''گورنمنٹ سنٹرل ٹریننگ کالج'' الہ آباد سے دیا اور فرسٹ ڈویژن سے کامیاب ہوئے۔ شری رام رتن پستک بھون بنارس میں ہندی، سنسکرت، اردو، انگریزی اور بعض دیگر زبانوں کی کتابیں اور نایاب دستاویزات ہیں۔ اسی کتب خانے میں منشی پریم چند کی بھی اکثر کتابوں کے مسودے ہیں۔ ان کے کپڑے اور مختلف امتحانات سے متعلق سرٹیفکیٹ ہیں۔ ''پرمانٹ جونیئر انگلش ٹیچرس'' کے

---

۱ پریم چند گھر میں، شیورانی دیوی، (مترجم: سید حسن منظر)، ص: ۱۷

۲ پریم چند گھر میں، شیورانی دیوی، (مترجم: سید حسن منظر)، ص: ۱۷

۳ زمانہ، کانپور، ۱۹۰۸ء، پریم چند نمبر، ص ۳

Scanned by CamScanner

سرٹیفکیٹ پر یہ بھی لکھا ہوا ہے :Teach to qualified not Mathematics (ریاضی پڑھانے کے قابل نہیں!) پریم چند ریاضی میں کمزور تھے۔

۱۹۰۴ء میں پریم چند نے الہ آباد یونیورسٹی سے ''اسپیشل ورنیکلر'' امتحان پاس کیا۔ اردو اور ہندی مضامین لیے۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں دو بار فیل ہوئے۔ یہاں بھی ریاضی کی وجہ سے کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۹۱۰ء میں انگریزی، منطق، فارسی اور جدید تواریخ لے کر انٹرمیڈیٹ سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا (اس وقت ریاضی لازمی نہیں اختیاری پرچہ تھا) یہ وہ زمانہ ہے جب کہ پریم چند گورنمنٹ اسکول میں اسسٹنٹ ٹیچر تھے، میٹرک کے بعد ہی ملازمت کی فکر ہوئی اس لیے کہ گھر کی حالت روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی۔ اس زمانے میں پانچ روپے کی ٹیوشن ایک وکیل کے لڑکے کو پڑھاتے تھے اور اصطبل کے اوپر ایک کچے مکان میں رہتے تھے۔ گورکھپور، کانپور، بنارس اور دوسرے کئی مقامات پر رہ کر پریم چند نے اسکول ماسٹر کی زندگی بسر کی۔

ادبی زندگی کا آغاز

جیسا کہ اوپر کی سطور میں یہ درج کیا جاچکا ہے کہ پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۰۰ء میں شروع ہو چکا تھا، لیکن باقاعدہ ۱۹۰۷ء سے کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ٹیگور کی کئی کہانیاں انگریزی زبان میں پڑھ چکے تھے۔ ان میں سے بعض کا ترجمہ بھی کیا۔ ۱۹۰۷ء سے قبل مختلف موضوعات پر مضامین بھی لکھے۔ ہندی ناول ''پریما'' لکھا۔ ''جلوۂ ایثار'' اور ''بازارِ حسن'' وغیرہ اس کے بعد کی تخلیقات ہیں۔ ''ہم خرما وہم ثواب'' ایک طویل قصہ ہے۔ ''اسرارِ معابد'' اکتوبر ۱۹۰۳ء سے فروری ۱۹۰۵ء تک۔ ''آوازِ خلق'' (ہفتہ وار اخبار) میں قسط وار شائع ہوا۔ اس وقت پریم چند نواب رائے الہ آبادی کے نام سے لکھتے تھے۔ ''ہم خرما وہم ثواب'' پر جاسوسی ناولوں کا چوکھا رنگ ہے۔ اسی دور میں ٹیگور اور بنکم چند چٹرجی کے فن سے متاثر ہوئے۔ ان دونوں فنکاروں کی تکنیک نے انھیں متاثر کیا۔ 'اسرارِ معابد' آریہ سماجی عقاید سے متاثر ہے اور سرشار کے اسلوب کا اثر لیے ہوئے ہے۔ ''ہم خرما وہم ثواب'' اور ''اسرارِ معابد'' دونوں معمولی تحریریں ہیں۔ جب ان کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور میں ہوا تو ''زمانہ'' اور ''آزاد'' میں مسلسل لکھتے رہے۔ تنقیدی مضامین بھی لکھے اور افسانے اور ڈرامے بھی۔ ابھی تک اپنا طرز بیان اور اسلوب خلق نہ کر سکے تھے۔ اس کا اعتراف خود کیا ہے۔ منشی دیانرائن نگم ایڈیٹر ''زمانہ'' نے لکھا ہے:

Scanned by CamScanner

''۱۹۱۴ء تک وہ اپنے طرزِ تحریر کے متعلق دوبدھا (پس وپیش) میں تھے۔ چنانچہ ۴؍ مارچ ۱۹۱۴ء کا خط ان کے دلی خیالات کا آئینہ ہے۔ لکھتے ہیں ''مجھے ابھی تک یہ اطمینان نہیں ہوا کہ کون سا طرزِ تحریر اختیار کروں۔ کبھی تو بنکم کی نقل کرتا ہوں، کبھی آزاد کے پیچھے چلتا ہوں۔ آج کل ٹالسٹائی کے قصے پڑھ چکا ہوں تب سے کچھ اسی رنگ کی طرف طبیعت مائل ہے، یہ اپنی کمزوری ہے اور کیا''۔[۱]

''اسرارِ معابد'' میں سرشار کے پیچھے چلتے نظر آتے ہیں۔ تو مشقی کی خامیاں موجود ہیں۔ طوالت پریشان کرتی ہے۔ عریاں نگاری میں لذتیت ہے مقفٰی عبارتیں ہیں۔ ''ہم خرما وہم ثواب'' میں داستانی عناصر زیادہ ہیں۔ عربی اور فارسی کی اضافتیں ہیں۔ 'سوزِ وطن' کی کہانیوں میں ٹیگور اور بنکم، سرشار اور شرر کے اندازِ بیان کی پہچان مشکل نہیں ہے جو ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا۔ نواب رائے کی یہ تخلیق زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوئی۔ اس میں پانچ کہانیاں تھیں۔ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' بھی اسی میں شامل تھا۔ طرزِ تحریر کی یہ مثال دیکھئے:

''مدتوں تک پرخار جنگلوں، شرربار ریگستانوں، دشوار گزار وادیوں اور ناقابلِ عبور پہاڑوں کو طے کرنے کے بعد دل فگار ہند کی پاک سرزمین میں داخل ہوا۔ شام ہوتے ہوتے وہ ایک کف دست میدان میں پہنچا جہاں بے شمار نیم کشتہ و نیم جاں لاشیں بے گور وکفن پڑی ہوئی تھیں۔ زاغ وزغن اور وحشی درندوں کی گرم بازاری تھی اور سارا میدان خون سے شنگرف ہو رہا تھا''۔[۲]

اس کہانی کا اختتام اس جملے پر ہوتا ہے ''وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔'' 'سوزِ وطن' کی پانچوں کہانیاں معمولی ہیں۔

منشی پریم چند کی ادبی زندگی کے ادوار:

پریم چند کا پہلا ناول ''اسرارِ معابد'' رسالہ آوازِ خلق میں ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو شائع ہوا۔ ۱۹۰۷ء میں دوسرا ناول ''کیشنا'' کے نام لکھا جواب موجود نہیں۔ اس کے بعد پانچ افسانوں کا مجموعہ ''سوزِ وطن''

Scanned by CamScanner

کے نام سے ۱۹۰۹ء میں منظر عام پر آیا۔ جس میں آپ نے آزادی، حریت، غلامی اور بغاوت کے موضوعات کو چھیڑا۔ حکومتِ برطانیہ نے اس پر پابندی عائد کردی۔ چنانچہ گورکھ پور کی حکومت نے اس کی تمام نقول حاصل کر کے جلا دیں اور آئندہ کے لیے سخت پابندی عائد کر دی۔ پریم چند نے ان افسانوں میں ''نواب رائے'' کے قلمی نام سے لکھا۔ بعد میں پریم چند کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ ان تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اردو کا پہلا اہم اور بڑا افسانہ نگار پریم چند ہے۔ اردو ادب میں یہ ایک ایسا نام ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کے دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح پریم چند نے پیار، محبت، عشق، ہیرو، ہیروئن جیسے سطحی موضوعات کو اپنے اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ حقیقت پسندی کی طرف اپنے ذہن و قلم کا رُخ موڑ دیا۔ پریم چند کی تخلیقات سے ہندوستان کی مٹی کی خوشبو آتی ہے۔

پریم چند کی افسانہ نگاری کو عام طور پر مختلف ادوار میں رکھ کر دیکھنے کا رواج رہا ہے۔ قمر رئیس کے اتباع میں اکثر ناقدین اور اساتذہ پریم چند کی افسانوی زندگی کے تین دور تسلیم کرتے ہیں۔ پہلے دور میں ان کی روایتی ابتدائی کہانیاں ہیں جن میں مادرِ وطن سے محبت اور ہندوستان کے غریبوں، کسانوں کے مسائل ابھرتے ہیں۔ دوسرے دور میں پریم چند قومی تحریک کے سرگرم کارکن اور مہاتما گاندھی کی قیادت میں لڑنے والے ایک سپاہی کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ آخری دور کے افسانوں میں حقیقت نگاری کی ایک سفاک اور بے باک سچائی بیان کرنے کی لے ابھرتی ہے جب وہ ''کفن'' اور ''نئی بیوی'' جیسے افسانے لکھتے ہیں۔ پہلے اور دوسرے ادوار پر عام طور سے تفصیل میں جا کر گفتگو کرنے کا رواج ہے کیوں کہ پریم چند کی شخصیت کا یہی مشہور ترین زاویہ ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنے مضمون ''پریم چند کی افسانہ نگاری کے دور'' میں ان کی افسانہ نگاری کے چار ادوار بتائے ہیں۔

پہلا دور :	۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۹ء	ابتدائی کوشش
دوسرا دور:	۱۹۰۹ء تا ۱۹۲۰ء	تاریخی اور اصلاحی افسانے
تیسرا دور:	۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۲ء	اصلاحی اور سیاسی افسانے
چوتھا دور:	۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۶ء	سیاسی اور فکری افسانے

مندرجہ بالا تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پریم چند کی افسانہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی سے

Scanned by CamScanner

ہوتا ہے۔ جنگِ عظیم اول ۱۹۱۴ء اور انقلاب روس ۱۹۱۷ء نے سامراجی قوتوں کے رعب میں رخنہ ڈال دیا تھا۔ پریم چند اسی نیم سیاسی دور سے متاثر ہوئے۔ ''سوزِ وطن'' اسی دور کا اظہار ہے۔

ادب کے ذریعے انقلاب اور معاشرے میں تبدیلی لانے کا تصور پریم چند کی ابتدائی کہانیوں سے ہی سامنے آ گیا تھا۔ اس حوالے سے وہ مقصدی ادب کی ایسی تحریک کا تسلسل تھے جو ۱۹۵۷ء کے بعد سرسید اور ان کے رفقاء کے ہاتھوں شروع ہوئی تھی۔ آپ کی ابتدائی کہانیوں میں حقیقت نگاری کا پہلو نمایاں رہا ہے۔ پریم چند اس نکتہ سے واقف تھے کہ حقیقت نگاری کا محدود تصور فن کو تباہ کر دیتا ہے۔

بقول شمیم حنفی:

> ''پریم چند کہانی کی اوپری سطح پر ہی حقیقت کا التباس قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے نیچے وہ آزادی چاہتے ہیں''۔[۱]

بقول سید وقار عظیم:

> ''وہ اپنی قوم اور ملک کی ہر اس چیز کو پرستانہ نظروں سے دیکھتے ہیں جو اسے دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہے''۔[۲]

پریم چند کی افسانہ نگاری میں بتدریج ارتقا نظر آتا ہے۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے ''سوزِ وطن'' سے لے کر آخری دور کے مجموعوں ''واردات'' اور ''زادِ راہ'' کے افسانوں میں بڑا واضح فرق محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے ہم ان کی افسانہ نگاری کو مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہیں پہلا دور ۱۹۰۹ء سے لے کر ۱۹۲۰ء کے عرصہ پر محیط ہے۔

دوسرا دور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک اور تیسرا دور جو نسبتاً مختصر دور ہے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک ان کی زندگی کے آخری چار سال کا احاطہ کرتا ہے۔

پہلے دور کے افسانوں میں رومانی تصورات نمایاں ہیں۔ دوسرے دور میں معاشرتی برائیوں کی اصلاح کی طرف توجہ دی ہے اسی طرح سیاسی موضوعات بھی اس دور کی اہم خصوصیت ہے۔ اپنے مختصر اور آخری دور میں پریم چند کے ہاں فنی عظمت اور موضوعات کا تنوع نظر آتا ہے۔ اپنے آخری دور میں انہوں

Scanned by CamScanner

نے نا قابل فراموش افسانے لکھے۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے ہم ان ادوار کو ملحوظ خاطر رکھیں گے اور انہی ادوار کو سامنے رکھ کر اُن کے فن کا تعین کرنے کوشش کریں گے۔ موضوعاتی اعتبار سے منشی پریم چند کے افسانوں کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ جب ان پر داستانوں کا اثر تھا

پہلے دور کے ابتدائی سالوں میں داستانوی اور رومانی رنگ غالب ہے۔ جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہو کر پریم چند اپنا پہلا افسانوی مجموعہ ''سوز وطن'' کے نام سے ۱۹۰۹ء میں زمانہ پریس میں کانپور سے شائع کرواتے ہیں جس کو انگریزی حکومت اپنے لیے خطرے کی گھنٹی محسوس کرتی ہے اور اس کی تمام کاپیاں ضبط کر لی جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ تاریخ اور اصلاح معاشرہ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ اس وقت تک وہ افسانوی تکنیک سے ناواقف تھے اور طلسم ہوشربا کے اسیر تھے۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک پریم چند ''مہوبا'' کے مقام پر ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ جہاں کے کھنڈرات انہیں ہندوؤں کی عظمتِ گذشتہ کی یاد دلاتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ حالی کی طرح انہیں بھی اپنے افسانوں کے ذریعہ ہندو قوم کی ماضی کی شان و شوکت اجاگر کرنا چاہیے۔ چنانچہ ''رانی سارندھا'' ۱۹۱۱ء میں ''راجہ ہردول'' ۱۹۱۲ء میں اور ''آلھا'' جیسے افسانے اسی جذبے کے تحت لکھے گئے۔

پریم چند کے دل میں ہندو راجاؤں اور رانیوں کی حوصلہ مندی اور خاندانی روایات کی پاسداری کا بڑا احترام تھا۔ ''رانی سارندھا'' میں انہوں نے ہندو قوم کے ماضی کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان سب افسانوں میں کسی نہ کسی تاریخی واقعہ کو دہرا کر ہندو قوم کو اسلاف کے کارنامے یاد دلانا مقصود ہے۔

۲۔ جب وہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھے:

ان تاریخی اور نیم تاریخی افسانوں کے بعد اپنے دوسرے دور میں پریم چند نے قومی اور معاشرتی اصلاح کی طرف توجہ دی، انہوں نے ہندو معاشرے کی قبیح رسوم پر قلم اٹھایا اور بیوہ عورت کے مسائل، بے جوڑ شادی، جہیز کی لعنت اور چھوت چھات جیسے موضوعات پر افسانے لکھے۔ اس دور میں وہ ایک مصلح کی حیثیت سے اپنے معاشرے کو احترام انسانیت اور مشرقی و مغربی تہذیب کے فرق اور اخلاق و اقدار کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

افسانہ نگاری کے دوسرے دور میں پریم چند سیاسی مسائل میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ یہ دور برصغیر میں تحریکوں کا دور تھا۔ تحریک خلافت، تحریک عدم تعاون، تحریک ستیہ گرہ، سول نافرمانی وغیرہ۔ برصغیر کے تمام باشندے ملک آزاد کرانے کا مطالبہ کررہے تھے پریم چند نے سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے قلم کے ذریعہ اس مہم میں شرکت کی ٹھانی اور سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ اگرچہ کوئی سیاسی آدمی نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے باقاعدہ طور پر سیاست میں حصہ لیا۔ لیکن شاید وہ سماجی موضوعات کے ساتھ ساتھ سیاسی موضوعات پر بھی یک لخت کر اظہار خیال کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے سرکاری ملازمت کا تمغہ گلے سے اتار پھینکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے افسانوں میں سیاست کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔

۳۔ جب انھوں نے انسانی نفسیات کا مطالعہ طبقاتی جبر کے حوالے سے کیا:

انسان ایک ہی قسم کے واقعات سے کس طرح متاثر ہوتا ہے؟ اس کے تعجب، حیرت، رنج وغم خوشی، غصہ، نفرت، حسد، بغض، رشک، رقابت اور اس قسم کے فطری جذبات کا اظہار کس طرح ہوتا ہے؟ یہ چیزیں سب انسانوں کے لیے یکساں ہیں اور اس لیے افسانوی بلندی حاصل کرنے کے لیے افسانہ نگار نفسیات سے زیادہ سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ پریم چند کے افسانے نفسیاتی مطالعہ اور مشاہدہ پر مبنی ہیں۔ اس چیز سے پریم چند نے اس قدر کام لیا ہے کہ وہ ان کے طرز بیان کی ایک خصوصیت بن گئی ہے۔ مثلاً وہ جملوں میں جہاں تشبیہات کا استعمال کرتے ہیں تو انہیں نفسیاتی محسوسات کو کام میں لاتے ہیں۔

جیسے جیسے پریم چند کے عہد سے ہماری دوری بڑھتی جارہی ہے، ان کے دور آخر کے افسانوں پر غور وفکر کے نظریے میں بھی تبدیلی آرہی ہے۔ شمیم حنفی نے اپنے ایک مضمون میں اسے پریم چند کا ''تیسرا موڑ'' کہا ہے۔ ۱۹۳۲ میں ''انگارے'' کی اشاعت سے موضوعات کے بعض بند دروازے وا ہوئے۔ خاص طور پر عورت اور مرد کے رشتوں کے ذیل میں منطقی اور نفسیاتی ترجیحات پر بات چیت شروع ہوئی۔ ''آخری تحفہ'' مجموعے کی اشاعت سے ''واردات'' تک پریم چند کے جو افسانوی مجموعے آئے، ان میں نہ صرف یہ کہ سماج کی اُن سچائیوں پر کھلے بندوں غور کرنے کی ایک خود کھائی دیتی ہے جن پر ماضی میں وہ پردہ ڈال دیتے یا آدرش کی ایک جھلملی چادر چڑھا دیتے تھے۔ بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند ''انگارے'' کے مصنفین کے گہرے اثر میں آچکے ہیں۔ کئی بار انسان کم عمر کے لوگوں سے بھی سیکھتا ہے۔

Scanned by CamScanner

اگر یہ بات نہیں ہوتی تو بالکل علاحدہ ایجنڈے کو موضوع بنا کر جس ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑ رہی تھی، پریم چند مٹھی بھر نوجوانوں کے بلاوے پر اپنی بنی بنائی اور مستحکم ادبی عمارت کو خطرے میں ڈالتے ہوئے صدارت کے لیے اتنی آسانی سے لکھنو کیوں پہنچ جاتے؟ ایسا لگتا ہے کہ ادبی لین دین کا بھی ایک سلسلہ دونوں نسلوں کے درمیان بالواسطہ طور پر قائم ہو چکا تھا۔ ادب کی تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے ہمیں پریم چند کے دورِ آخر کی کہانیوں پر غور کرتے ہوئے ان مسائل پر بہ تفصیل بحث کرنی ہوگی۔

پریم چند نے عام طور پر سادہ کہانیاں لکھی ہیں۔ عجلت میں انھیں اکہری کہانیوں کے طور پر طالب علم اور استاد دونوں دیکھ سکتے ہیں۔ غزل میں سہل ممتنع کی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ پڑھنے والے نے غائر توجہ نہ کی تو شعر قدر دانی سے محروم ہو سکتا ہے۔ پریم چند کے ہاں ایسی کہانیوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ میں دو مثالیں پیش کروں گا۔ ''دوبیل'' اور ''عیدگاہ'' کہانیاں چوتھی اور پانچویں جماعتوں سے داخلِ نصاب ہوتی ہیں۔ کیا ان کہانیوں کو بڑی جماعتوں میں بھی کھیل تماشے، تفریح اور میلے ٹھیلے کی کہانی سمجھ کر پڑھ لیا جائے۔ شاید یہ پریم چند کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ دونوں کہانیاں ۱۹۳۰ء کے بعد کی ہیں۔ 'عیدگاہ' تو ۱۹۳۳ء میں عالمِ تحریر میں آئی۔ پختہ عمری میں پریم چند کو بچوں کی کہانیاں لکھنے کی کیوں سوجھی؟ پریم چند نے بچوں کی کہانیوں کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا، آخر اس میں انھیں کیوں شامل نہیں کیا؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود بھی انہیں ''بڑوں'' کی کہانیاں تصور کرتے تھے۔ دوبیل میں ہندستان کی قومی تحریک کے گرم اور نرم رویوں کو ہیرا اور موتی کی شکل میں پرکھا جائے تو اس کہانی کی سیاسی معنویت روشن ہو جائے گی۔ اسی طرح عیدگاہ میں حامد کا سب سے بڑا کارنامہ چمٹا خریدنا نہیں بلکہ یہاں ایک غریب، بے یار و مددگار بچے کی شکل میں پریم چند آئندہ کے ذمہ دار شہری کی شناخت کرتے ہیں۔ دورانِ مطالعہ اگر پریم چند کی سادہ کہانیوں کی تفہیم کی ان نزاکتوں سے ہم باخبر نہیں ہوں تو پریم چند کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

جس طرح ہم پریم چند کے ادبی اور فنی ارتقا کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہیں، اسی طرح پریم چند کے فکری ارتقا پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ پریم چند صحافت پیشہ رہے اور اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی انھوں نے بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کیے۔ ان کے مضامین مطبوعہ شکل میں جلد در جلد دستیاب ہیں۔ اسی طرح پریم چند کے اردو اور ہندی مکاتیب کی تعداد بھی کم نہیں۔ ان

Scanned by CamScanner

خطوط میں پریم چند کے ادبی نظریے وضاحت کے ساتھ موجود ہیں۔ پریم چند جیسے عالم کے ذہن میں اگر مضامین اور خطوط کے بطن سے پیدا ہوئی ایک علاحدہ شخصیت موجود ہو تو مطالعے کا ایک نیا افق سامنے آ سکتا ہے۔

پریم چند ہمارے مقبول ترین ادیبوں میں سے ایک ہیں۔ اس لیے ان کی تخلیقات پر روز نئی نئی توجیہیں آتی رہتی ہیں۔ اردو سے کافی زیادہ مقدار میں ایسا ضروری مواد ہندی میں موجود ہے جس میں ہر لمحہ اضافہ ہو رہا ہے۔ سال دو سال میں انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی اس موضوع پر بعض کتابیں سامنے آ جاتی ہیں۔ اس حیثیت سے پریم چند کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اردو افسانوں میں حقیقت نگاری کی بہترین مثالیں پیش کی ہیں جن میں ہر جگہ عالمگیر حقائق، عام فطرت انسانی کی نفسیات اور بلندی خیال کو مدنظر رکھا ہے۔

اسی طرح مجموعی حوالے سے پریم چند کے ہاں جذبات نگاری بھی، تنقید حیات ہے اور ترغیب و اصلاح بھی۔ اور یہی وہ معاشرتی اور سیاسی شعور تھا جس نے پریم چند کو حقیقت پسند افسانہ نگار بنایا اور پھر ان کے افسانے اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی تقاضوں کی ترجمانی کرنے لگے۔ ان کے افسانوں میں ملک و قوم کے لیے ایثار و محبت کے جذبے بیدار ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پریم چند نے ایک ماہر نفسیات کی طرح محکوم قوموں کو عزم و ہمت کے گر سکھائے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ انسان دوستی اور وطن دوستی کی بہترین مثالیں پیش کی ہیں۔ یوں پریم چند کے ہاں سچی وطن دوستی، سماجی اصلاح کا جذبہ، دیہاتی زندگی کے مرقعے، طبقاتی کشمکش اور کردار نگاری کے خوبصورت نمونے ملتے ہیں۔ انہوں نے تخلیقی جبلت کو محض افسانہ نگاری کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ اس میں مقصدیت کی روح کو سمو کر ایک مصلح قوم کا کردار بھی ادا کیا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو پریم چند نے اپنے افسانوں میں زندگی کے ہر دو پہلوؤں المیہ و طربیہ کو سمو دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں ہر طبقے کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ وہ روہیلوں، بندیلوں اور راجپوتوں کی جنگ جو یانہ صفات اور جرأت مندانہ اقدار کا ذکر بھی کرتے ہیں اور ہندو مہاجنوں، ساہوکاروں، سیٹھوں اور زمینداروں کے ظلم و تشدد اور گھناؤنے کرداروں کو بھی بے نقاب کرتے ہیں اور غریب کسانوں، مفلس کاشتکاروں اور نیچی ذات کے چماروں کی بے بسی اور بے کسی کی المناک

Scanned by CamScanner

داستانیں رقم کرتے ہیں۔ان کے ہاں رانی سارندھا جیسی جاں باز اور آن پر مٹنے والی رانیاں بھی ہیں اور کام چور و کاہل گھیسو اور مادھو جیسے المیہ کردار بھی ملتے ہیں۔

دیہی زندگی کی ترجمانی:

چوں کہ پریم چند کی زندگی کا بڑا حصہ دیہات میں گزرا اس لیے ان کی کہانیوں میں دیہات اور اس کی زندگی کے مسائل اپنی رنگا رنگ تصویروں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔پریم چند کے بہترین افسانے بھی وہی ہیں جن میں دیہی زندگی کے مسائل پیش کیے گئے ہیں۔مثلاً، کفن، پوس کی رات، پنچایت قربانی، آہ بے کس، اندھیر، نجات، سوا سیر گیہوں۔ بیٹی کا دھن وغیرہ پریم چند کے اہم اور نمائندہ افسانے ہیں۔ان تمام افسانوں میں دیہی زندگی کے معاشی، سماجی، مذہبی مسائل کو اس ہنرمندی سے پیش کیا ہے کہ اس کی حقیقی تصویر آنکھوں میں بھر جاتی ہے۔

ہندوستان کی تین چوتھائی آبادی دیہاتوں میں بستی ہے۔جن کا بنیادی ذریعہ معاش کھیتی باڑی ہے۔گھریلو صنعت وحرفت بھی ان لوگوں کا ذریعہ معاش رہا ہے۔اس کے ذریعہ ضروریات زندگی کی بہت سی چیزیں کی جاتی تھیں جنکا تبادلہ غلے کے ذریعے کسان کیا کرتے تھے۔اس طرح ہر طبقے کی ضروریات کی تکمیل ہو جایا کرتی تھی۔انگریزوں نے اس نظام کو ختم کر دیا اور صنعت وحرفت کو فروغ دینے کے بجائے اسے پامال کرنے کی شعوری کوشش کی جس کے نتیجے میں کسان معاشی بدحالی کا شکار ہوئے۔کسانوں کی معاشی ابتری کی ایک وجہ انگریزوں کا اپنا زمیندارانہ نظام بھی تھا۔جسکے جبر کے نیچے ان کے خزانے معمور ہوتے گئے اور کسان بدحال سے بدحال۔پریم چند نے اپنے افسانوں میں استعماریت کے اس نظام سے پیدا ہونے والے مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہے۔زمیندار طبقے نے لگان وصولنے کا جو نظام وضع کیا تھا اسکی وجہ سے کسان کے پاس لگان ادا کرنے کے بعد اتنا اناج بھی نہ بچ پاتا تھا کہ وہ اپنا پیٹ بھر سکے۔ اس کا تذکرہ ''مزار آتشیں'' میں یوں ہوا ہے:

> ''دونوں وقت کا ذکر ہی کیا جب مہتو کو یہ بات حاصل نہ تھی۔جس کے دروازے پر چھ بیل بندھے نظر آتے تھے تو پیاگ کی کیا ہستی تھی۔ہاں ایک وقت کی روٹی میں کلام نہ تھا''۔[1]

Scanned by CamScanner

''سمریاترا'' کی نوہری بھی انھیں حالات کا ذکر کرتی ہے:

''ہم اور تم کیا ابھی بوڑھے ہونے کے لائق تھے۔ ہمیں پیٹ کی آگ نے جلا دیا ہے بولو ایمان سے یہاں اتنے آدمی ہیں کسی نے ادھر پچھلے چھ مہینے سے پیٹ بھر روٹی کھائی ہے، گھی کس کو سونگھنے کو ملتا ہے، کبھی نیند بھر سوئے، جس کھیت کا لگان تین روپے دیتے تھے اب اس کے نو دس دیتے ہو''۔[۱]

انگریزوں کی لائی ہوئی جدید صنعت نے گاؤں کے کسانوں کے ساتھ دوسرے مزدور طبقوں کو بھی متاثر کیا۔ پہلے جولاہے اپنے بنے ہوئے کپڑے بنتے تھے جس کا انھیں معاوضہ مل جاتا تھا۔ ان کپڑوں کو وہ خود پہنتے بھی تھے۔ جدید صنعت کے نتیجے میں قدیم صنعت تباہ ہوئی جس کے سبب میں روزگار کا مسئلہ پیدا ہوا اب انگلینڈ کے پاور لوم کے کپڑے سستے داموں دستیاب ہونے لگا۔ جس سے یہ طبقہ بری طرح متاثر ہوا۔ اس مسئلہ کی ہولناک صورت حال کو ''لاگ ڈانٹ'' کا بچپن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''ہمارے دادا نانا چھوٹے بڑے گاڑھا گزی پہنتے تھے ہماری دادی نانیاں چرخا کاتا کرتی تھیں۔ سب دھن دیش میں رہتا تھا۔ ہمارے جولاہے بھائی چین کی بانسری بجاتے تھے اب ہم ودیش کے بنے ہوئے رنگین کپڑوں پر جان دیتے ہیں''۔[۲]

مذکورہ اقتباسات سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ نئے زمیندارانہ نظام اور جدید صنعت نے کس طرح کسانوں اور مزدوروں کو معاشی بدحالی سے دوچار کیا تھا اور پریم چند نے ان مسائل کو کس ہنرمندی سے اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ پریم چند کے زمانے کا دیہی سماج مختلف قسم کے جبر و تشدد کا شکار تھا۔ ایک طرف استعماری نظام نے اسے معاشی بدحالی سے دوچار کیا تھا تو دوسری طرف قدیم روایات اور جھوٹی شان و شوکت نے بھی سماج کو بے بس اور مجبور بنا رکھا تھا۔ ہر سماج کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں لیکن جب اس نظام میں انتہا پسندی کا رجحان بڑھنے لگتا ہے تو سماج کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے اور اس سماج کے افراد سماجی جبر کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ پریم چند سے پہلے پنچایت اور برادری کا جو سربراہ ہوتا تھا اس کا شیرازہ تقریباً منتشر ہو چکا تھا لیکن اس میں سختی برقرار تھی جسکی وجہ سے دیہات کے حکیموں کو

Scanned by CamScanner

کفن: ایک مطالعہ

''کفن'' پریم چند کی زندگی کی آخری تخلیقات میں سے ایک ہے جس میں زندگی بھر کا علم، تجربہ اور شعور جھلک آیا ہے۔ پریم چند اپنی مختصر زندگی میں مختلف قسم کے حادثات و تجربات سے گزرے جس کی وجہ سے فکر و نظر کے حوالے سے بھی کئی موڑ اور پڑاؤ آئے۔ وہ پہلے آریہ سماجی تھے اس کے بعد گاندھیائی فکر سے وابستہ ہوئے اور پھر آخر آخر میں وہ اشتراکیت کے بھی قائل ہوئے ان کی زندگی کے آخری دور کی کہانیاں اور بالخصوص ناول گئودان میں اشتراکیت کا جذبہ و فلسفہ نمایاں طور پر کام کر رہا ہے۔ کفن میں بھی بالواسطہ یا بلا واسطہ یہ جذبہ اور فلسفہ باطنی سطح پر جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ فنی سطح پر بھی جو پختگی اس افسانے میں دکھائی دیتی ہے وہ ان کے دیگر افسانوں میں کم نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کفن صرف اردو کا ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے افسانوی ادب کے چند بڑے افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اردو کے بعض نقاد تو اسے دنیا کے بڑے افسانوں میں شمار کرتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی.....

> ''میں کفن کے بے تکلف دنیا کے افسانے کے سامنے رکھ سکتا ہوں یہ افسانہ (اور بہت سے پہلوؤں کے علاوہ) Black Humory کا شاہکار نمونہ ہے اور اردو افسانے میں ایک نئے اسلوب کا آغاز کرتا ہے۔''
>
> (پریم چند کے اسلوب کا ایک پہلو، امکان، بمبئی ۱۹۸۰ء ص: ۱۷۵)

Scanned with CamSc

اس افسانے کا پہلا اور بڑا کمال یہ ہے کہ یہ ایک ایسے دو کرداروں کے ذریعہ شروع ہوتا ہے جس کی سماج میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ نااہل ہیں کاہل ہیں اور بے حس بھی ہیں چوری چماری کر کے کسی طرح پیٹ بھرتے ہیں ان دونوں کرداروں کا پریم چند یوں تعارف کراتے ہیں.....

''چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دِن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ اس لیے انھیں کوئی رکھتا ہی نہیں تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج ہوتو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی..... گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہ تھا۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے دنیا کی فکروں سے آزاد قرض سے لدے ہوئے گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں..... مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے۔''

افسانے کی ابتدا بھی آلو کھانے سے ہوتی ہے کہ دونوں باپ بیٹے جھونپڑے کے باہر الاؤ جلائے دوسرے کے کھیت سے چرائے ہوئے آلو بھون بھون کر کھا رہے ہیں اور جھونپڑے کے اندر گھیسو کی بہو اور مادھو کی بیوی بدھیا دردِزہ سے تڑپ رہی ہے اس کی چیخ وکراہ سن کر گھیسو تو چونکتا ہے اور بیٹے سے کہتا ہے۔ ''جا دیکھ تو آ'' لیکن بیٹا مادھو جھنجھلا کر کہتا ہے..... ''مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی دیکھ کر کیا آؤں.....'' اور وہ اس لئے بھی اندر نہیں جاتا کہ اسے اندیشہ ہے کہ وہ اندر گیا تو اس کے حصہ کا آلو اس کا باپ کھا جائے گا۔ احساس کی یہ ستم ظریفی، بے حسی ان انسانی واخلاقی اقدار کی پامالی کی طرف اشارہ کرتی ہے جہاں غربت وافلاس اپنی انتہا پر پہنچ کر سارے اقدار کو تہس نہس کر دیتی ہے۔ جہاں ہر طرح کا احساس، اخلاق، شرافت، حمیت، غربت کا

Scanned with CamSc

کوئی وجود نہیں رہ جاتا لیکن یہ سب کیوں؟ اس کا جواب بھی اس افسانے میں ملتا ہے۔ لیکن اس سے قبل اس کردار پر بھی گفتگو ضروری ہے جو زندہ کردار نہیں ہے یعنی بدھیا کا کردار، ایک ایسی عورت کا کردار جو بیوی ہے اور مادھو کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ ایک ایسے غریب گھر میں وہ بیاہ کر آئی ہے جہاں غربت ہی غربت ہے لیکن اس کے باوجود اس عورت نے ایسی خستہ حالی اور بے حسی کی دنیا میں ہلکی سی ایک جان ڈال دی ہے۔ ذرا یہ جملے دیکھئے.....

"جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا بھی انتظام کر لیتی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔"

اس اقتباس کے پہلے جملہ کی بلاغت پر غور کیجئے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے ہمارے گھر اس کے بعد ہمارے سماج کے تمدن و تہذیب کی بنیاد عورت ہوا کرتی ہے۔ عورت کے دم سے زندگی میں زینت ہے استحکام ہے۔ عورت کا اتنا بڑا احترام اردو کے افسانوی ادب میں کم دیکھنے کو ملتا ہے ورنہ زیادہ تر عورت محبوب و معشوق ہے اور اس کے حسن کے چرچے ہیں۔

ایسی سلیقہ مند، محنتی عورت کی آمد سے گھر میں تمدن کا چراغ تو روشن ہوا لیکن مرد یعنی گھیسو اور مادھو کا رویہ یہ تھا.....

"جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے بلاتا تو بے نیازی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ سے مر رہی ہے اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔"

Scanned with CamScanner

مادھو جونا تجربہ کار ہے، اس خوف میں بھی یہ سوچتا ہے.....

''میں سوچتا ہوں کہ کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہوگا؟
سونٹھ گڑ تیل کچھ تو نہیں ہے گھر میں.....''

ماں باپ کا سب سے بڑا ارمان اولاد ہوتی ہے۔ باعث رحمت و راحت لیکن مادھو کے لئے باعث زحمت و اذیت.....غریبی اور بے حسی کا ایک روپ یہ بھی ہوتا ہے۔لیکن تجربہ کار گھیسو بڑے اعتماد سے کہتا ہے.....

''سب کچھ آئے گا.....بھگوان بچہ دیں تو.....جو لوگ ابھی
پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نولڑکے
ہوئے۔گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا.....''

اس اعتماد میں بلا کا طنز پوشیدہ ہے اور یہ طنز ہے معاشرہ کے نظام اور نیت کا جہاں کے رہنے والے اس نوع کے کام، مدد اور ہمدردی کے حوالے سے کم پاپ اور پنیہ کے حوالے سے زیادہ کرتے ہیں۔ان کے ذہن میں گھیسو اور مادھو جیسے نکمّے اور غریب لوگوں کی مدد کا جذبہ کم اپنے گناہوں کو دھونے اور سماج میں اپنی حیثیت کی نمائش کرنے کا زیادہ ہوتا ہے اور یہ بات گھیسو اچھی طرح سمجھتا ہے۔وہ تو یہ بھی سمجھتا ہے کہ جس سماج میں دن رات کام کرنے والوں کی حالت ان سے زیادہ اچھی نہ تھی اس لئے وہ سوچتا تھا کہ وہ تمام مزدوروں اور کسانوں سے زیادہ بہتر ہے۔ نہ کوئی رعب نہ تابعداری، نہ ڈر وخوف، اور یہ احساس.....''وہ خستہ حال ہے تو کم از کم کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدے نہیں اٹھاتے۔''

بدھیا دردِزہ میں تڑپ کر دم توڑ دیتی ہے تو ان دونوں کو کفن کی فکر ہوتی ہے اور یہاں سے ان دونوں کرداروں کا ایک نیا ڈرامہ شروع ہوتا ہے اور کہانی بھی ایک

Scanned with CamSc

نئے رخ سے آگے بڑھتی ہے .....لوگوں کی انسانی کمزوریاں ۔ثواب وعذاب کا احساس ان سب سے گھیسو اچھی طرح واقف تھا۔ چنانچہ کچھ انتظام تو ہو گیا باقی کے لئے گاؤں کے زمیندار تو تھے ہی ۔سب کچھ سمجھتے ہوئے انھیں اپنی زمینداری کا پاس تو رکھنا ہی تھا۔ دو روپئے مدد کے طور پر دیئے۔ زمیندار کی مدد سے بنیا بھی انکار نہ کر سکا جلد ہی پانچ روپئے کی رقم ہاتھ آ گئی اور یہ دونوں کفن و دیگر اشیاء خرید نے بازار چل پڑے۔ ادھر اُدھر کی باتیں مثلاً ''کپھن'' ہلکا سا لے لیں ۔یا ''یہی پانچ روپیہ ملتے تو کچھ دوادارو کرتے۔'' دونوں کی نیت ڈانواڈول ہونے لگتی ہے دونوں ایک دوسرے کی بدنیتی کو تقویت پہنچا رہے تھے۔ پریم چند لکھتے ہیں.....

''دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے ۔ بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آ پہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے اور ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی، کچھ گزک، دونوں برامدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔''

عالم سرور میں یہ دونوں دیہاتی اپنی دفاع میں جو مکالمے نکالتے ہیں ان میں بلا کی معنویت اور طنز پوشیدہ ہے۔ گھیسو کہتا ہے.....

''کھپن لگانے سے کیا ملتا جل ہی تو جاتا.....''

مادھو کہتا ہے.....

''بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے، پھونکیں، ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے''

لیکن مادھو بہر حال جوان ہے اور نادان بھی، شراب کے نشہ میں بھی اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے.....

Scanned with CamScanner

''جو وہاں ہم لوگوں سے پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے۔''

تو گھیسو بڑے اعتماد سے جواب دیتا ہے.....

''تو کیسے جانتا ہے کہ اسے کفن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال کیا دنیا میں گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کفن ملے گا اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے ہیں .....وہی لوگ دین گے جنہوں نے اب کی دیا ہے۔''

گھیسو کا یہ غیر معمولی اعتماد رحم دل اور خوف کرنے والوں پر غیر معمولی طنز کرتا ہے۔ دونوں کفن نہ خرید کر پورے سماج پر گہری چوٹ کرتے ہیں انھیں سماج کی اور بالخصوص امیر طبقہ کی کمزوریوں کا احساس ہی نہیں عرفان ہے اسی لئے تمام تکالیف کے باوجود انھیں ہر طرح کا اعتماد اور اطمینان ہے اسی لئے دونوں کردار بالخصوص تجربہ کار گھیسو کا ہر جملہ مخصوص قسم کے معاشرتی طنز میں ڈوبا ہوا ملتا ہے۔

افسانے کا مرکزی خیال دراصل وہ معاشرتی نظام ہے جہاں سب کچھ بے ترتیب اور بے مقصد ہے جس کی وجہ سے ایک بڑے اور کمزور طبقہ کا مسلسل استحصال ہوتا رہتا ہے جس کے نتیجہ میں ایک ایسا بڑا طبقہ اور بڑا ہوتا جا رہا ہے جو بے بس ہے کمزور ہے اور جس کا کوئی یار و مددگار نہیں۔

پریم چند جب تک گاندھیائی اثرات میں رہے، ایسی نا انصافیوں کا ذکر ضرور کرتے رہے لیکن ایک مخصوص شرافت و تہذیب کے ساتھ لیکن اشتراکیت سے متاثر ہونے کے بعد ان کے قلم میں دھار آجاتی ہے۔ کفن کے مکالموں میں دھار ہے، نقاب کشائی ہے جو صرف ہندوستان کے ہی نہیں بلکہ دنیا کے سماجی نظام کے کھوکھلے پن کو پیش کرتا ہے۔ گھیسو مادھو صرف ہندوستانی کردار نہیں ہیں بلکہ آفاقی ہیں۔ اسی

Scanned with CamSc

لئے اس افسانے میں جو بے لاگ اور بے رحم حقیقت نگاری آ گئی ہے وہ ان کے کم افسانوں میں نظر آتی ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں.....

''حقیقت نگاری میں شعور کی رو کا استعمال پریم چند نے اس چابکدستی سے اپنے کسی اور افسانے میں نہیں کیا۔ اشاروں ہی اشاروں میں انھوں نے ماضی اور حال کے واقعات کے درمیان ایک ایسا ربط پیدا کیا ہے کہ پڑھنے والا ذرا سی دیر کو بھی اپنے ذہن کو افسانے کے بنیادی خیال کے اثر سے الگ نہیں کر سکتا۔''

اردو کے روایتی سانچوں میں ڈھلے افسانوں کے مقابلے کفن نہ صرف جدید فن افسانہ نگاری کی اعلیٰ ترین مثال ہے بلکہ اس کا پلاٹ، کردار سب کچھ اس قدر فنکارانہ انداز میں پیش کئے گئے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ افسانہ نہ صرف پریم چند کا شاہکار ہے بلکہ اس افسانے سے جدید افسانے کے فن کا آغاز ہوتا ہے۔ تبھی آل احمد سرور نے بڑے اعتماد سے کہا.....

''میں اسے اردو کی بہترین کہانیوں میں سمجھتا ہوں۔ اس میں ایک لفظ بھی بیکار نہیں۔ ایک نقش بھی دھندلا نہیں۔ شروع سے آخر تک چستی اور تلوار کی سی تیزی اور صفائی ہے۔'' (تنقیدی اشارے)

کفن بلا شک وشبہ اردو ہندی کی بڑی کہانیوں میں سے ایک ہے لیکن جیسا کہ مزاج ہے کہ ہر بڑی تخلیق نزاعی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ منفی اور مثبت بحثیں ہونے لگتی ہیں چنانچہ کفن کے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ اردو میں وقار عظیم، آل احمد سرور اور شمس الرحمٰن فاروقی کی مثالیں میں پیش کر چکا ہوں۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن کفن کے بارے میں کھل کر منفی بات تو نہیں کرتے تاہم وہ پریم چند کے بارے میں یہ رائے ضرور رکھتے ہیں.....

''پریم چند کی ٹریجڈی یہی ہے۔ انسان کے کردار کی تعمیر

Scanned with CamScanner

گھناؤنے ماحول میں ہوتی ہے۔ بنیادی جبلتوں اور حالات کے رشتوں میں توازن نہیں پیدا ہوتا۔ جو مصیبت، آفت، تکلیف، اذیت اور ناخوشگوار انجام ہے وہ کرداروں کی بنیادی جبلتوں اور فطری خواہشوں سے پیدا نہیں ہوتا۔'' (پریم چند کے افسانوں میں المیہ کردار)

کفن کے حوالے سے بھی وہ یہ کہتے ہیں.....

''پریم چند نے ان کرداروں (گھیسو مادھو) کے ذریعہ جو احتجاج کیا ہے اور ان کی سماجیت جس طرح رونما ہوئی ہے۔ اس سے اپنی حسرتناک اور مریضانہ زندگی کے نقوش اور زیادہ اجاگر ہوتے ہیں..... پریم چند کے ایسے المیہ کردار اپنی اندرونی بربادی اور المیہ کا شکار ہیں۔''

عہد حاضر کے ایک ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار کہ جن کی افسانہ نگاری اور ناول نگاری کا پانی تیزی سے بہہ رہا ہے لکھنؤ کے پریم چند سیمینار (جولائی ۱۹۰۵ء) میں ایک ملاقات میں کہنے لگے کہ..... ''مجھے بھی اس سیمینار میں کفن پر مقالہ پڑھنا تھا۔ لیکن جب میں نے اس بار غور سے اس افسانہ کو پڑھا تو اس میں کمزوریاں اور جھول دکھائی دیئے۔ اس لئے قلم نہ چل سکا۔'' وقت کم تھا اس لئے وہ کمزوریوں کی نشاندہی نہ کر سکے۔ ایک زمانہ میں جب جدیدیت کا شور تھا تو ایک تیز طراز، بے باک قسم کے افسانہ نگار کہا کرتے تھے کہ اردو افسانے کو سب سے زیادہ نقصان پریم چند اور کفن کہانی سے پہنچا ہے..... یہ تو خیر ایک غیر سنجیدہ مثال تھی۔ ہندی میں پوری سنجیدگی سے اعتراضات کئے گئے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر اندر ناتھ مدان نے کفن کے بنیادی خیال کے بارے میں کہا کہ اس میں پریم چند نے دولت کی دشمنی تلاش کی وہ یہ بھی کہتے ہیں.....

''کہانی جس سچ کو اجاگر کرتی ہے وہ زندگی کے سچ سے میل نہیں کھاتا۔''

Scanned with CamScanner

بچن سنگھ کا تو خیال ہی اور ہے۔ وہ کہتے ہیں.....

''پریم چند کی کفن کے تجزیہ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ لوگ پہنچاتے ہیں جو اسے پریم چند کی پوری روایت سے جوڑ کر ایک ٹھہری ہوئی تاریخی نظر کا ثبوت دیتے ہیں۔ کہانی کے چند ٹکڑوں خاص طور پر کمزور ٹکڑوں کی بنیاد پر جو لوگ ترقی پسند کہانی ثابت کرتے ہیں وہ تنقید اور تجزیہ کو گمراہ کرتے ہیں ان دونوں طریقوں سے پریم چند کی صحیح پہچان گم ہو جاتی ہے۔ حقیقتاً پریم چند نے اپنی آخری کہانیوں میں اپنے ہی سلسلوں کو توڑا ہے اور نئے تناظر میں پیش کیا ہے۔''

.....اور آگے وہ لکھتے ہیں.....

''کفن کہانی پریم چند کی دیگر کہانیوں سے بالکل مختلف ہے۔ اسی لئے ان کی کہانیوں سے متعارف لوگوں کے لئے یہ ایک ان بوجھ پہیلی ہو جاتی ہے۔ یہ پریشانی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم سوچیں کہ کفن اتنی الگ کہانی کیوں ہے.....''

بچن سنگھ، مدان پر تو اعتراض کرتے ہیں وہ کہہ تو دیتے ہیں کہ کفن کہانی کے سچ اور زندگی کے سچ سے میل نہیں کھاتی لیکن یہ دونوں کیا ہیں یہ نہیں بتاتے..... یہی اعتراض بچن سنگھ پر بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کفن کو سب سے الگ کہانی تو کہتے ہیں لیکن تفصیل سے اس علیحدگی پر روشنی نہیں ڈالتے..... ان کا خیال خود ایک ان بوجھ پہیلی بنا رہتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ادب فہمی کے لئے تاریخی تناظر کو پورے طور پر ضروری اور معتبر نہیں سمجھتے لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ادبی تجزیہ میں تاریخ گمراہ ہونے سے بچاتی ہے۔ پھر بھی وہ تاریخی حوالوں کو کم پریم چند کے کچھ ذاتی خطوط کا حوالہ ضرور دیتے ہیں

Scanned with CamScanner

جس میں پریم چند کی ذہنی ونفسیاتی کیفیت بدلتی دکھائی دیتی ہے جس سے فکروفن کی بدلتی ہوئی صورتوں کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس اندازے میں ملک، معاشرہ کے حالات اور نئے انسانوں اور ذہنوں کی نفسیات کا وہ ذکر نہیں کرتے جس کے پیش نظر وہ نہ صرف کفن، نئی بیوی، نجات جیسے افسانے اور مہاجنی تہذیب اور ادب کا مقصد جیسے مضامین لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب صرف ہندوستان ہی نہیں دنیا کے سیاسی اور سماجی حالات تیزی سے کروٹ بدل رہے تھے۔ جس کے اثرات دنیا کے دوسرے افسانوی ادب پر نہ صرف پڑ رہے تھے بلکہ وہ تیزی سے اردو میں ترجمہ ہو کر منظر عام پر آ رہے تھے۔ چیخوف، ترگنیف، ٹالسٹائے وغیرہ کے افسانوں کے اثرات اردو افسانے پر دکھائی دینے لگے تھے۔ اشتراکی رجحانات تیزی سے فکروخیال میں داخل ہو رہے تھے۔ نئی نسل ان سے متاثر ہو کر پرانے اور دقیانوسی خیالات کی شدت سے مخالفت کر رہی تھی۔ جس کی واضح مثال ''انگارے'' کی اشاعت تھی جس کے ہنگاموں اور دیا نرائن نگم کے حوصلہ افزا تبصرے کا اثر پریم چند پر بھی پڑ رہا تھا۔ نیز کہانی کے فکروفن پر بھی نمایاں اثر پڑ رہا تھا۔ قمر رئیس لکھتے ہیں.....

> ''پریم چند کے حساس شعور پر ان نئے حالات کی پرچھائیاں بھی پڑنے لگی تھیں۔ اگرچہ مشکل یہ تھی کہ وہ گاندھی واد کے زیر اثر صنعتی معاشرے کی انفرادیت پسندی، مادیت اور شور وشر سے خائف تھے نوجوان ادیب اور دانشور پریم چند کی روایت کا احترام کرتے تھے لیکن نئے تغیر پذیر حالات میں وہ اسے کافی نہیں سمجھتے تھے وہ نئے سماجی رشتوں اور ذہنی و جذباتی حقیقتوں کے موثر فنی اظہار کے نئے سانچوں کے متلاشی تھے۔'' (اردو افسانے میں ''انگارے'' کی روایت)

Scanned with CamSc

''انگارے'' کی آگ اور اس میں شامل افسانوں کی گرمی اور ملک و معاشرہ کے بدلتے بلکہ بگڑتے ہوئے ماحول نے پریم چند کو پگھلا کر رکھ دیا۔ وہ بہت کچھ سوچنے بلکہ بدلنے پر مجبور ہوئے۔ اس حادثہ کے بعد جو دوستوں کو خطوط لکھے ان میں ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ بہتر طور پر لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۳۴ء کے آس پاس ایک خط میں وہ اندرناتھ مدان کو لکھتے ہیں.....

''شروع میں فکر کے نتیجہ میں نہیں بلکہ روایتی اعتماد کی وجہ سے میں ایک دیوی شکتی پر یقین رکھتا تھا.....وہ یقین اب ٹوٹ رہا ہے۔''

اسی طرح وہ جینندر کے نام بھی ایک خط میں لکھتے ہیں.....

''ایشور پر یقین نہیں آتا.....تم تو آستکتا کی طرف جا رہے ہو۔ پکے بھگت بن رہے ہو.....میں اندیشے سے پورا ناستک ہوتا جا رہا ہوں۔ میں پرماتما تک نہیں پہنچ سکتا۔ میں اتنا وشواس نہیں کر سکتا۔ کیسے وشواس کروں جب دیکھتا ہوں کہ بچہ بلک رہا ہے، روگی تڑپ رہا ہے..... یہاں بھوک ہے.....تاپ ہے۔''

ان کے بعد کے مضامین میں سماجی، سیاسی اور اقتصادی صورت کا جائزہ اور اشتراکیت پر مکمل یقین کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ کہانی کے فکر و فن کے حوالے سے بھی ۱۹۳۴ء میں ایک انٹرویو میں جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں.....

''محض واقعہ کے اظہار کے لئے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ جذبات حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔ کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے.....''

یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں.....تاہم اتنی باتیں اور مثالیں ہیں جس کے

Scanned with CamScanner

حوالے سے پریم چند کے نقادوں اور تحقیق کرنے والوں نے واضح طور پر کہا ہے کہ ۱۹۳۲ء سے لے کر ۱۹۳۶ء تک کا دور پریم چند کے فکر وفن اور افسانہ نویسی کا ایک اہم، انقلابی اور بدلا ہوا دور ہے جہاں وہ اشتراکیت کے بہت قریب آ چکے تھے بلکہ مکمل اعتماد کرنے لگے تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا کفن میں اشتراکیت یا اشتراکی جمالیات کے عناصر موجود ہیں.....؟ یہ سوال نازک اور اہم ہے کہ اس بہانے ادب میں اشتراکی خیال اور جمال کے استعمال اور رائج ہونے کے معاملات بھی سر اُٹھاتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ نظریہ یا خیال کوئی بھی ہو بالخصوص اشتراکی نظریہ وہ اپنے آپ میں کوئی سانچہ نہیں رکھتا کہ جس میں تخلیق بہ آسانی ڈھل جائے نظریہ تو صرف ادیب کو راستہ دیتا ہے اس کو وژن عطا کرتا ہے۔ یہ وژن ہی پریم چند کو یہ نظریہ دیتا ہے کہ اس سماج میں ایسے افراد بھی ہیں جو جانوروں سے بھی زیادہ بدتر زندگی گزارتے ہیں۔ کیا گھیسو مادھو کی جانوروں کی سی زندگی پڑھنے والوں کو رونگٹے کھڑے کر دینے والی کیفیت سے دوچار نہیں کرتی..... کیا آپ کو نہیں لگتا کہ کفن میں اگر ایک طرف گاؤں کی ثقافتی و حادثاتی زندگی کی دلدوز تصویر سامنے آتی ہے تو دوسری طرف معاشی استحصال کی دردناک والمناک تصویر بھی ابھرتی ہے۔

جھونپڑے کے باہر باپ بیٹے کا آلو کھانا، اندر بدھیا کا دروازہ میں تڑپنا، جاڑے کی رات کا ہونا، سارے گاؤں کا اندھیرے میں ڈوبے رہنا، بجھے ہوئے الاؤ کا علامتی اشارہ بغیر کہے سب کچھ کہہ دیتا ہے۔ پھر اس درمیان باپ بیٹے کی گفتگو پورے ماحول کو مضبوط کرتی ہے۔ پھر اس کے بعد پریم چند کا یہ کہنا..... ''چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔'' ''کسانوں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لئے پچاس تھے..... کاش دونوں سادھو ہوتے تو انھیں قناعت اور توکل کے لئے ضبط نفس

Scanned with CamSc

کی مطلق ضرورت نہ تھی.....''۔''جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تہذیب کی بنیادی ڈالی تھی.....''۔''نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر ان سب جذبوں کو انھوں نے بہت پہلے جیت لیا تھا.....''''ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو اسے کیا پُن نہ ہوگا.....''''وہی لوگ دیں گے جنھوں نے اب کی دیا ہے۔ ہاں وہ روپے ہاتھ نہ آئیں گے.....''

اس کے بعد شراب خانے کا منظر۔ پھر ان دونوں کا رقص.....ان سب منظروں و مکالموں سے کہانی نہ کہ مارکسی جمالیات کے دبیز احساس میں ڈوب جاتی ہے بلکہ اور آگے بڑھ کر فلسفہ کا روپ لے لیتی ہے اور ڈی۔ ایچ۔ لانس نے کہا ہے کہ بڑا فکشن ہمیشہ فلسفہ کا روپ لے لیتا ہے..... پوری کہانی کا مزاج سماجی شعور اور انسانی فلسفہ میں رچا بسا ہے اگر چہ بیان نہایت سادہ اور پُر اثر، اور یہی افسانے کے فن کی معراج ہوا کرتی ہے جہاں سہل ممتنع میں بڑا اور گمبھیر فلسفہ جنم لیتا ہے اور کہانی آسان سے مشکل کا سفر طے کرتی ہے۔ پریم چند اپنی اکثر کہانیوں میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ کفن تو ان معنوں میں شاہکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر شکیل الرحمٰن جو اکثر پریم چند کے المیہ کرداروں پر نکتہ چینی کرتے ہیں، کفن کے کرداروں کے بارے میں کہنے پر مجبور ہوتے ہیں.....

''کفن کے گھیسو اور مادھو کے کردار میں حقیقت نگاری
اپنی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ نمایاں ہے۔''

صداقت اور حقیقت کی اپنی جمالیات ہوا کرتی ہے جو راست طور پر مارکسی جمالیات سے اپنے رشتے استوار کرتی ہے۔ ہر چند کہ جمالیات کی کوئی بھی قسم ہو، اس کے نپے تلے پیمانے بنانا ممکن و مناسب نہیں۔ خود مارکسی بھی جمالیات کی آدرشوادی سوچ کی نفی کرتا ہے کیونکہ اس کا ماننا ہے کہ فطرت کے مناظر و مراحل اپنے آپ میں

Scanned with CamScanner

خوبصورت ہوتے ہیں اور بدصورت بھی۔ جمالیاتی فکر اور رجحان تو انسان میں تاریخی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور سماج کے حالات وتصورات سے رشتہ قائم کرتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فن اور آرٹ کو بھی تاریخی اور سماجی ارتقا سے الگ کر کے دیکھا نہیں جا سکتا۔ فن کے روپ من مانے ڈھنگ سے آگے نہیں بڑھتے بلکہ سماجی تغیرات وتناظرات میں آگے بڑھتے ہیں۔

''کفن'' کی تمام تر عظمتوں کو ذات اور حالات کی روشنی سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کہانی میں فکر اور فن دونوں کا اس قدر معنی خیز، فکر انگیز انجذاب وامتزاج ہوا ہے کہ ہر طبقۂ خیال کے لوگوں کی نظر میں یہ ایک شاہکار ویادگار کہانی بن جاتی ہے۔

☆☆☆

Scanned with CamSc

مکتوبات

مکتوباتِ پریم چند کے تعلق سے کلیات پریم چند کی جلد نمبر سترہ (۱۷) میں مدن گوپال نے پریم چند کے چھ سو نوّے (۶۹۰) خطوط یکجا کر دیے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں پریم چند کے خطوط پہلی بار منظرِ عام پر آئے ہیں۔ جن کے توسط سے مصنف کی مجموعی شخصیت پر بھرپور کام کرنے میں آسانی ہوگئی ہے۔ چھ سو پینتالیس (۶۴۵) صفحے پر مشتمل مذکورہ مجموعہ کے مطابق پہلا خط ۳۰ر جنوری ۱۹۰۵ء کا اور آخری خط ستمبر ۱۹۳۶ء کا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی تفصیل مجموعہ سے نہیں مل پاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر صفیر افرہیم:

''اس سے زیادہ نہ تو مقدمہ میں ذکر ہے اور نہ ہی کوئی فہرست وغیرہ ترتیب دی گئی ہے۔ کتنے خط کس کے نام ہیں؟ کس زبان میں لکھے گئے ہیں؟ ان کو نوعیت کیا ہے؟ شیرازہ بندی کس طرح کی جاسکتی ہے، یہ سارے کام قاری کے سپرد کر دیے گئے ہیں۔ لہٰذا میں نے اس جانب توجہ دی تو اردو میں چار سو پینسٹھ (۴۶۵) ہندی میں دو سو بیس (۲۲۰) اور انگریزی میں لکھے گئے پانچ خط منظرِ عام پر آتے ہیں۔ شخصیات کے نام چھ سو ساٹھ (۶۶۰)، ایڈیٹر ادارے کے نام تیئیس (۲۳) اور بغیر نام کے سات (۷) خط مذکورہ مجموعہ میں ہیں۔ اٹھاون (۵۸) لوگوں کے نام لکھے گئے خطوط میں محض دیانرائن نگم کے نام تین سو پچاس (۳۵۰) مکاتیب ہیں۔ ''[1]

شخصیات کے نام لکھے گئے خطوط کو اس طرح ترتیب دیا جاسکتا ہے:

	شخصیات کے نام	خطوط کی تعداد
۱۔	دیانرائن نگم	350
۲۔	امتیاز علی تاج	42
۳۔	مولوی عبدالحق	02

[1] مکتوباتِ پریم چند کا معروضی مطالعہ: فکر و نظر، علی گڑھ دسمبر ۲۰۰۵ء ص ۵۱

Scanned by CamScanner

۴۔	حسام الدین غوری	05
۵۔	اُپندر ناتھ اشک	05
۶۔	محی الدین قادری زور	01
۷۔	سجاد ظہیر	02
۸۔	منشی دُرگا سہائے سرور	02
۹۔	اختر حسین رائے پوری	01
۱۰۔	جیندر کمار	53
۱۱۔	بنارسی داس چترویدی	20
۱۲۔	جے شنکر پرساد	03
۱۳۔	رائے کرشن داس	02
۱۴۔	سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا	05
۱۵۔	نچن شرما اُگر	07
۱۶۔	ونود شنکر ویاس	09
۱۷۔	دھنی رام	07
۱۸۔	شیو پوجن سہائے	22
۱۹۔	مہتاب رائے	15
۲۰۔	دشرتھ پرساد دویدی	02
۲۱۔	راجیشور بابو	06
۲۲۔	صدگرو شرن اوستھی	06
۲۳۔	دشرتھ لال جی	02
۲۴۔	مہادیوی پرساد	01
۲۵۔	آنند راؤ جوشی	11

Scanned by CamScanner

۲۶۔	پرواسی لال ورما	27
۲۷۔	مہاراجہ الور	01
۲۸۔	مہاویر پرشاد (سمپادک متوالا)	02
۲۹۔	پدم سنگھ شرما	05
۳۰۔	انسویا پرساد	01
۳۱۔	شری رام شرما	08
۳۲۔	ورما سحر بھنگا می	01
۳۳۔	گنگا پرساد اگنی ہوتری	01
۳۴۔	کیشو رام بھروال	04
۳۵۔	آچاریہ نریندر دیو	01
۳۶۔	رام چند سنہا	02
۳۷۔	جناردن پرساد جھا	04
۳۸۔	رام چندر ٹنڈن	04
۳۹۔	پنڈت رام داس گوڑ	01
۴۰۔	اوشا دیوی مترا	14
۴۱۔	شیورانی دیوی	05
۴۲۔	للت شنکر اگنی ہوتری	06
۴۳۔	مادھوری (سمپادک)	02
۴۴۔	دلارے لال بھارگو	01
۴۵۔	وین بہاری شری واستو	01
۴۶۔	جے۔پی بھارگو	01
۴۷۔	ہری ناتھ	01

Scanned by CamScanner

۴۸۔	کنور سریش سنگھ	01
۴۹۔	رگھویر سنگھ (سیتامئو)	01
۵۰۔	ویریشور سنگھ	07
۵۱۔	اندر بساوڑا	08
۵۲۔	بہادر چند چھابرا	01
۵۳۔	مانک لعل جوشی	01
۵۴۔	پنڈت مکھن لال چترویدی	01
۵۵۔	اندر ناتھ مدان	01
۵۶۔	ہرن مے	01
۵۷۔	رام کرشن مہتا	01
۵۸۔	رام کشور چودھری	01
۵۹۔	نند کشور	01
۶۰۔	ویریندر کمار جین	03
۶۱۔	رام کمار ورما	02
۶۲۔	پربھاکر ماچولے	01
۶۳۔	پری رنجن سین	01
۶۴۔	پدم کانت مالویہ	01
۶۵۔	راج کمار ورما	01
۶۶۔	بھدنت آنند کوسلیاین	02
۶۷۔	انسوریہ پرساد پانھک	01
۶۸۔	شنکرن	01
۶۹۔	ڈرگا پرساد کھتری	01

Scanned by CamScanner

۷۰۔	شریمتی کملا چودھری	01
۷۱۔	شیام لال	01
۷۲۔	بھیرومل سندھی	01
۷۳۔	بھگوتی پرساد باجپئی	01
۷۴۔	بنارس کلکٹر	01
۷۵۔	ایڈیٹر سرسوتی	01
۷۶۔	ایڈیٹر زمانہ	03
۷۷۔	منیجر زمانہ (خواجہ عبدالسلام)	12
۷۸۔	نارمل اسکول (گورکھپور)	01
۷۹۔	منیجر دارالاشاعت (لاہور)	01
۸۰۔	ایڈیٹر نیرنگ خیال	01
۸۱۔	'بھارت' سمپادک	01

.....

660	
شخصیات کے نام	58
ایڈیٹر یا ادارے کے نام	23
بغیر نام کے	07
کل تعداد	690

Scanned by CamScanner

(ii)

صباح الدین عمر، فروغ اردو لکھنؤ کے پریم چند نمبر (۱۹۷۸ء) میں لکھتے ہیں کہ:

''ہر ادیب کے ادب میں اس کی شخصیت کا کچھ نہ کچھ جلوہ ضرور نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شخصیت بہت بڑی حد تک پراگندہ نقاب اسی وقت ہوتی ہے جب اس کے ذاتی خطوط کا مطالعہ کیا جائے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ ان خطوط میں آورد نہ ہو بلکہ آمد ہو اور وہ نہ اس مقصد سے لکھے گئے ہوں کہ انھیں کسی اخبار یا رسالے میں اپنی علمیت کا اظہار مقصود ہو۔ صحیح معنوں میں خط کی تعریف میں وہی خط آتا ہے جو مولانا عبدالحق کے الفاظ میں ''دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہو۔'' ص۔۲۳۴

لہٰذا پریم چند کے خطوط کے مطالعہ سے جو پہلی بات سامنے آئی ہے وہ یہ کہ موصوف لفظ 'افسانہ' یا 'کہانی' کے بجائے اپنی کہانیوں کو عموماً 'قصہ' قرار دیتے ہیں۔ ستمبر 1910ء کا ایک خط جو دیا نرائن نگم کے نام ہے ملاحظہ کیجئے:

''اب کی میں نے 'وکرمادت کا تیغہ' ایک قصہ لکھنا شروع کیا ہے۔ یہ قصہ ملا کر میرے پانچ قصوں کا مجموعہ نکالنے کا کافی مسالہ ہو جائے گا۔ اگن کنڈ، سیر، سارندھا بے غرض محسن اور وکرمادت کا تیغہ۔'' ص۔۱۲

اگلے خط میں لکھتے ہیں:

''قصہ لکھا ہوا تیار ہے۔ صرف نقل کرنا باقی ہے۔ میرے قصص کے مجموعے کا خیال رکھیے گا۔'' جب آپ اودھ اخبار میں پہنچ جائیں، اس وقت اسے نکالنے کی فکر کرنا مناسب ہوگا۔'' ص۔۱۷

۶ر فروری کا ایک خط ملاحظہ ہو:

''پریم چند چھپی اس پریس کا پہلا کام ہوگا۔ اپنے تئیں مبارک باد دیتا ہوں۔ بیس قصوں سے زائد ہو گئے ہیں۔ دو ابھی ہمدرد کے دفتر میں پڑے ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں ہمدرد کھلے گا بھی یا ٹھنڈا پڑ گیا۔ بہر حال دو تین ماہ میں پچیس قصے ضرور ہو جائیں گے۔'' ص۔۲۱

Scanned by CamScanner

اس خط کو بھی دیکھئے:

''پریم چند کے قصے ۲۱/آپ کے یہاں چھپ گئے ہیں، ۲ ہمدرد کے یہاں ہیں۔ وہ دونوں آج منگوالیتا ہوں تب دو کی کمی رہ جائے گی اور یہ دو کتابت کے پورے ہونے تک بن جائیں گے۔ ترتیب کیونکر دوں۔ ابواب کی صورت میں نہیں آئے ورنہ میں نے چاہا تھا کہ شجاعت، خودداری، ایثار وغیرہ کے عنوان سے ترتیب دوں۔ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دلچسپی اور اختصار کے لحاظ سے ان کی ترتیب دی جائے۔'' ص۔۲۳

خط نمبر ۲۵ میں لکھتے ہیں:

''اگر میری ترتیب کے مطابق ۱۲ قصے نہ آسکتے ہوں تو آپ ذرا سی ترمیم کر کے اس ۹ جزو میں ۱۲ قصے کھپا سکتے ہیں۔'' ص۔۳۱

کچھ اور خطوط کے اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

''ایک کارڈ بھیج چکا ہوں۔ آج یہ قصہ ارسالِ خدمت ہے۔'' ص۔۳۷

''سرِ پُرغرور نام کا ایک قصہ لکھا ہوا ہے۔ صرف کچھ ترمیم باقی ہے۔ اسے صاف کرنا پڑے گا۔'' ص۔۳۹

''بستی سے ایک قصہ عنقریب بھیجوں گا۔ لکھا ہوا تیار ہے۔ صرف صاف کرنا باقی ہے۔'' ص۔۴۸

''میرے خیال میں تین قصے اُن کے پاس ہیں (۱) منزلِ مقصود (۲) اماوس کی رات (۳) یاد نہیں آتا۔'' ص ۶۵

''اب پریم بتیسی حصہ اوّل کی کتابت شروع کرانے کا ارادہ ہے۔ اس میں ذیل کے قصص ہوں گے۔''

نیچے ۱۶/افسانوں کے نام دیے ہیں۔ ص۔۸۹

مجموعہ کے شروع کے ایک سو ایک خط میں کہیں بھی کہانی یا افسانہ استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہر جگہ قصہ لکھا گیا ہے لیکن خط نمبر ایک سو دو (۱۰۲) میں پہلی بار قصہ کے ساتھ ساتھ کہانی کی اصطلاح بھی

Scanned by CamScanner

استعمال کی گئی ہے۔

امتیاز علی تاج کے نام ہے:

''.....میں اپنی ۳۲ کہانیوں کو دو حصّوں میں نکالنا چاہتا ہوں.....اگر آپ کی معرفت کچھ انتظام ہو سکے تو فرمایئے گا۔ قصّے سب زمانہ اور دوسرے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔'' ص ۹۹

پریم چند جو قصّہ کہانی کے باہمی فرق سے بخوبی واقف ہیں اور جس کا اظہار وہ اپنے پہلے افسانوی مجموعہ 'سوز وطن' کے دیباچے میں اشارتاً کرتے بھی ہیں:

''ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشے میں متوالے ہو رہے تھے.....دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے کہ جب قوم کے نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی، اور اصلاحِ تمدّن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے کے قصص و حکایات زیادہ تر اصلاح اور تجدید ہی کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیالات نے بلوغت کے زینہ پر ایک اور قدم آگے بڑھایا ہے اور حب الوطنی کے جذبات لوگوں پر سر ابھارنے لگے۔ کیوں کر ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا''

''مکتوباتِ پریم چند کے معروضی مطالعے'' میں یہ بحث اٹھائی گئی ہے کہ پریم چند قصّہ کہانی کے فرق کی وضاحت اپنے مضامین مثلاً 'میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں'، 'مختصر افسانہ'، 'مختصر افسانے کا فن' وغیرہ میں بالتفصیل کرتے ہیں، تو پھر وہ خط میں قصّہ کی اصطلاح ہی کیوں استعمال کرتے ہیں، یہ فکشن تنقید میں ایک اہم سوال ثابت ہو سکتا ہے۔ دراصل انسانی نفسیات، خواہشات جذبات، احساسات کی کئی پرتیں مکتوبات پریم چند کے توسط سے اترتی چلی جاتی ہیں اور پھر جو شکل ابھرتی ہے وہ مکمل طور پر ایک ادیب کی ہوتی ہے۔ ضرورتیں جسے کمزور بناتی ہیں مگر فولادی عزائم ثابت قدمی کا ثبوت ہیں اور اس کی تشکیل میں معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ خطوط میں چھوٹی چھوٹی ضرورتیں، دبی دبی، سہمی ہوئی خواہشیں بھی جھانکتی نظر آتی ہیں مثلاً وہ دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

''مئی کے مہینے میں، میں نے آزاد، کے لیے سترہ (۱۷) کالم لکھے اور غالباً جون کے پہلے نمبر میں بھی چار کالم سے کم نہ ہوگا۔ کُل اکیس (۲۱) کالم ہوتے ہیں۔ اگر آپ حساب دوستاں کے طور پر مجھے ایک واچ عنایت کرسکیں تو 'آزاد' کی یادگار رہے گی۔ مگر وہ واچ نہیں جس کے تین روپے میں سولہ (۱۶) چیزیں ملتی ہیں۔ مضبوط گھڑی ہو تو زیادہ نہیں تو تین چار سال تک تو ساتھ دے۔'' ص۔۴۱

امتیاز علی تاج کے نام لکھے ایک خط میں وہ کہتے ہیں:

''رہا معاوضہ وہ قصہ پڑھ لینے پر آپ خود طے کر لیجئے گا۔ ہندی والوں نے مجھے چار سو روپے دیے ہیں اور اردو میں مجھے اتنی اُمید نہیں مگر ۲۱ سطری صفحہ کے ۱۲ کے حساب سے بھی قبول کر لینے میں مجھے تامل نہ ہوگا۔'' ص ۱۰۳

ایک اور خط ملاحظہ ہو:

''بازارِ حسن کے متعلق، آپ اسے اگر ہمیشہ کے لیے چاہتے ہیں تو مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔ میں اردو پبلک سے واقف ہوں۔ یہاں ہمیشہ کے معنی ہیں، زیادہ سے زیادہ تین ایڈیشن اور وہ دس سالوں میں یا اس سے بھی زیادہ۔ اس لیے میں ایسی شرطیں ہرگز نہیں پیش کرسکتا جو نا معقول ہوں۔ میرے خیال میں پہلے ایڈیشن کے لیے آپ ۲۰ فیصدی رکھیں اور بقید دو ایڈیشنوں کے لیے ۱۰ فیصدی۔'' ص۔۱۴۹

۹ر جون ۱۹۳۲ء کے ایک خط میں وہ اُشا دیوی کو مشورہ دیتے ہیں:

''نولکشور پریس والے تمھیں ایک روپیہ پرشٹ دیتے ہیں تو سویکار کرلو۔ اس کے ساتھ دس پرتی شت رائلٹی بھی دے دیں تو اچھا۔ پستکوں کی بکری آج کل بہت کم ہے۔ لیکھک اکڑے تو کس بل پر۔'' ص۔۲۳۶

بات خوشامد یا اکڑ کی نہیں، اُجرت کے مطالبے یا معاوضے کی بھی نہیں، ضرورت کی ہے کہ ایک ادیب، فنکار کی اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورتیں بھی ہوتی ہیں جنھیں پورا کرنے کے لیے اُسے کبھی کبھی عام انسانوں جیسا رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ شخصیت کا یہ رُخ قاری پر ادیب کے خطوط سے ہی ظاہر ہوسکتا

Scanned by CamScanner

ہے۔ اسی لیے آج مکتوب کے مطالعہ کی اہمیت بڑھ گئی ہے کیونکہ خطوط کے ذریعے ہی کچھ چونکا دینے والے انکشافات بھی ہوتے ہیں[1]۔ مثال کے طور پر ۲۳؍جون ۲۵ء کو دیانرائن نگم کو لکھا یہ خط کئی زاویوں سے سوچنے پر مجبور کرتا ہے:

''بابو رگھوپتی سہائے کا یہ خط بھیجتا ہوں، انھوں نے مولانا عبدالحق صاحب کے پاس بھیجنے کے لیے میرے پاس بھیجا ہے۔ مجھے ممدوح کا پتہ نہیں معلوم ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں ایک اردو پروفیسر کی جگہ ہے۔ 250 روپے ماہوار، 25 سالانہ ترقی۔ رگھوپتی سہائے اس کے لیے کوشاں ہیں۔ مضمونِ خط سے معلوم ہوگا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ آپ برائے کرم اسی ڈاک سے اس خط کو منشی عبدالحق کی خدمت میں بھیج دیں۔ میں نے رگھوپتی سہائے سے دریافت بھی کیا تھا تو ان سے معلوم ہوا کہ انھوں نے قریب قریب سب مرحلے طے کر لیے ہیں۔ صرف معترضوں کی زبان بند کرنے کے لیے دو چار خاص مسلمان اصحاب کی سفارش درکار ہے۔'' ص۔ ۲۵۹۔۲۶۰

فراق کے تعلق سے اپنے ایک اور خط مورخہ ۱۰؍نومبر ۱۹۱۹ء میں نگم صاحب کو لکھتے ہیں:

''بابو رگھوپتی سہائے آج کل سول سروس کی فکر میں پریشان ہیں۔ ان کا نمبر انتخاب میں آٹھواں ہے۔ کبھی الہ آباد کبھی لکھنؤ کا چکر لگا رہے ہیں۔'' ص ۱۳۱

پریم چند نہایت فعال شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے احباب کو بھی سرگرم عمل دیکھنا چاہتے تھے۔ فراق کے بارے میں دیانرائن نگم کو لکھتے ہیں:

''بابو رگھوپتی سہائے عجیب سُست آدمی ہے۔ 'تعشق' پر ایک مضمون لکھا، وہ انگریزی میں۔ میر کا آدھا لکھ کر چھوڑا ہے۔ رویندر ناتھ کا مضمون Message of the Forest جولائی کے ماڈرن ریویو میں ہے۔ شاید اسے ترجمہ کریں۔'' ص۔ ۱۳۲

---

[1] مکتوباتِ پریم چند کا معروضی مطالعہ۔ فکر و نظر، علی گڑھ۔ دسمبر ۲۰۰۵ء۔ ص ۵۲

Scanned by CamScanner

مکتوب ایک نثری صنف ہے۔ یہ ایک شوق بھی ہے اور ضرورت بھی۔ ہر شخص کسی نہ کسی کو خط لکھتا ہے، دوسروں کے خط وصول کرتا اور ان کے جواب دیتا ہے۔ خط لکھنے کے متعدد مقاصد ہوتے ہیں، کبھی تو خط کسی اہم کاروبار کی بنا پر لکھے جاتے ہیں، کبھی پرانے تعلقات اور رشتوں کو نبھانے کے لیے اور کبھی محض اس وجہ سے کہ کوئی ایسا شخص جو دور ہے، یاد آتا ہے، اس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے، خواہ ان باتوں کا مطلب کچھ بھی نہ ہو۔ عالم، کم علم، بے علم ہر طرح کا آدمی خط لکھنے یا خط لکھوانے پر مجبور ہے۔ اسی لیے خط لکھنے کا کوئی ایک بندھا ٹکا انداز نہیں۔ جتنے خط اتنے انداز۔ خط بھیجنے والا کون ہے۔ وصول کرنے والا کون ہے اور خط بھیجنے کا سبب کیا ہے۔ یہ تینوں چیزیں مل کر خط کا مواد اور اسلوب متعین کرتی ہیں۔ خط کے طرز تحریر کا دارومدار اس پر ہے کہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کا علم کتنا اور ذوق کیسا ہے۔ گفتگو کرتے وقت ہمیں نہ غور وفکر کرنے کا موقع ملتا ہے نہ اپنے خیال کے لیے اچھے الفاظ تلاش کرنے کا، لیکن خط جو گفتگو کا بدل ہے اس میں دونوں کا کچھ نہ کچھ موقع مل جاتا ہے۔ یہیں سے خطوط کی ادبی حیثیت کا آغاز ہوتا ہے کہ ان کے الفاظ، ان کی عبارت، ان میں پیش کردہ خیالات عام سطح سے قدرے بلند ہوتے ہیں۔ پھر یہ خطوط شاعروں اور ادیبوں کے قلم سے نکلے ہوں تو ان میں ادبی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی سے ان میں بیان کی ہوئی باتیں کچھ اس انداز سے سامنے آتی ہیں کہ کسی خاص مقام یا وقت میں محدود محسوس ہوتیں۔ وہ باتیں ذاتی ہوتے ہوئے بھی عمومی دلچسپی کا سامان مہیا کرتی ہیں۔

اہم اشخاص کے خطوط سے ہمیں جہاں اہم افراد کے بارے میں معلومات مہیا ہوتی ہیں وہیں ان کے توسط سے اس دور کے ایسے واقعات کا بھی علم ہوتا ہے جو دوسرے ذرائع سے ہمارے سامنے نہیں آتے ہیں۔ پریم چند کے خطوط سیدھے سادے، عام فہم انداز میں ہیں ہندی کی آمیزش لہجہ کے حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ ان کے اسالیب کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

Scanned by CamScanner

بھائی جان، تسلیم!

''کیا ایشور کے ساتھ احباب بھی مجھ سے روٹھ جائیں گے''۔ ص ۱۵۵ بنام دیا نرائن نگم گورکھپور ۱۲/ اگست ۱۹۲۰ء

خط انتظار کے بعد ملا۔ مشکور ہوں۔ بتیسی چھپ گئی۔ ص ۱۵۷ امتیاز علی تاج ۲۶/ اگست ۱۹۲۰ء

برادرم!

''بعد دعا۔ کل ایک کارڈ لکھ چکا ہوں۔ آج پھر پریس کے متعلق تم سے کچھ مشورہ کرنا ہے''۔ ص۔ ۱۷۱ بنام مہتاب رائے، ۱۰/ اکتوبر ۱۹۲۰ء

برادرم تسلیم!

'' آپ کی طولانی خموشی نے غضب کیا۔ کہکشاں ابھی اب تک نہیں آیا۔ کیا معاملہ ہے۔'' ص۔ ۱۷۴ بنام امتیاز علی تاج گورکھپور، ۲۰/ اکتوبر ۱۹۲۰ء

بھائی جان، تسلیم!

''تصویر ملی۔ بہت ممنون ہوں۔ اس نے ملاقات کی آرزو دو چند کر دی۔ آپ کی میرے ذہن میں جو تصویر تھی وہ کچھ اور ہی تھی۔ میں اگر مصور ہوتا تو شعر، اور 'ادب' کی غالباً یہی تصویر بناتا''۔ ص۔ ۱۸۸، بنام امتیاز علی تاج ۸/ فروری ۱۹۲۱ء

پریہ ور، وندے!

'دانز' مل گیا تھا۔ لڑکوں کو پہلے ہی سے اس کا انتظار تھا۔ اسے دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑے''۔ ص ۳۹۴ بنام کنور سریش سنگھ ۳۰/ جولائی ۱۹۳۱ء

Scanned by CamScanner

مذکورۂ بالا خطوط دیانرائن نگم، مہتاب رائے اور امتیاز علی تاج کے نام ہیں۔ درج ذیل خط کیشو رام بھروال کو لکھا گیا ہے جو ٹوکیو میں مقیم تھے۔ رس بہاری بوس انقلابی تحریک میں شامل تھے اور رابندر ناتھ ٹیگور کے سکریٹری بھی رہے تھے۔ انھوں نے پریم چند کے کئی افسانوں کے جاپانی میں ترجمے کر کے شائع کرائے تھے۔

عزیز من کیشو رام جی!

.....ہندوستان میں ادبی زندگی بہت حوصلہ شکن ہے۔ پبلک کی طرف سے کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔ آپ اپنا دل نکال کر رکھ دیجئے لیکن عوام پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میری کسی تصنیف کا شاید ہی تیسرا ایڈیشن چھپا ہو۔ کچھ کتابوں کے تو پہلے ایڈیشن ہی ابھی ختم نہیں ہوئے ہیں۔ ہمارے کسان غریب اور ان پڑھ ہیں۔ پڑھا لکھا اور روشن خیال طبقہ یورپی ادب پر جان دیتا ہے۔ گھٹیا کتابیں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔ لیکن میری کتابوں کا حال یہ ہے کہ ان کی تعریف تو کی جاتی ہے لیکن ان کے لیے خریدار مشکل ہی سے ملتا ہے۔'' ۳۱ راگست ۱۹۲۸ء

مکتوب نگاری کو جن خصوصیات کی بنا پر قبولِ عام حاصل ہے ان میں سے ایک سادگی ہے۔ یہ سادگی ہی ہے جس پر ہزاروں بناؤ سنگھار قربان ہوتے ہیں۔ سادہ بیانی خطوط کی جان ہے۔ اس میں پڑھنے والوں کو وہ مزہ آتا ہے جو ادب کی کسی دوسری صنف میں نہیں آ سکتا۔ پریم چند کے تمام خطوط سیدھی سادی زبان کے مظہر ہیں۔ دراصل اِن کے اندازِ تحریر کی ممتاز ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو لکھتے تھے۔ سادہ اور بے تکلف لکھتے تھے۔ ان کے خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند الفاظ کے انتخاب یا مطالب کی تلاش میں ستر ستر کنویں نہیں جھانکتے تھے اور نہ ہی الفاظ کا ڈھیر لگاتے تھے۔ ان کے خطوط سراسر آمد ہیں آورد نہیں۔ چوں کہ پریم چند اپنے جذبات کے اظہار میں تصنع اور ریاکاری سے کام نہیں لیتے تھے اس لیے اِن کے خطوط میں اِن کی شخصیت کا پورا روپ ملتا ہے۔

مکتوباتِ پریم چند کی روشنی میں ڈاکٹر صغیر افراہیم نے ''اُردو ہندی اور لسانی اتحاد'' کے تعلق سے لکھا ہے کہ پریم چند نے اپنے خطوط میں بنیادی طور پر جو انداز اختیار کیا ہے وہ اردو اور ہندی کو قریب لانے

Scanned by CamScanner

میں معاون و مددگار ثابت ہوا ہے۔ انھوں نے ہندی کے بہت سے خطوط میں اردو کے الفاظ، محاورات، مکالمات بلکہ القاب وآداب بھی استعمال کیے اور اسی طرح اردو کے خطوط میں ہندی کی لسانی خوبیوں کو رچا بسا دیا ہے۔ مثلاً وہ دیا نرائن نگم کو ہمیشہ ''بھائی جان'' ''تسلیم! لکھتے ہیں۔ بناری داس چترویدی کو ''محترم بناری داس جی''۔ رام کمار کو ہمیشہ ''پیارے رام کمار'' سے مخاطب کرتے ہیں۔ جینیندر ''پریہ'' میں تو پروی لال ورما ''بندھوور''۔ ''عزیز برادرم''۔ حد درجہ ممنون، دوستوں کے خطوں میں ضرور لکھا ہوتا ہے۔ برابر والوں سے جن سے عموماً رسمی تعلقات تھے ''جناب من!'' یا پھر ''برادر عزیز'' لکھتے تھے۔ اختتام عموماً ''آپ کا مخلص'' ''تمھارا'' یا پھر ''آپ کا'' ہوتا۔ چند خطوط ملاحظہ ہوں:

پریہ متوالا جی!

اس سے پہلے بھی آپ اس غریب پر دو ایک بار عنایت کر چکے ہیں۔ وہ زخم ابھی ہرا ہے لیکن یہاں ان لوگوں میں ہیں جنھیں تیغ قاتل کے تڑپنے میں ہی مزہ آتا ہے، تیر نگاہ جنھیں تسکین نہیں ہوتی۔ اپنے دل کے دونوں ٹکڑے (۱) کایا کلپ اور (۲) پریم پرتیما لیے ہوئے حاضر ہوتا ہوں۔ خوب ارمان نکال لیے، جس میں............بھی باقی نہ رہے۔ کب؟

آشا ہے، انتظار میں دم نہ توڑنا پڑے گا۔ تو مجھے تو انتظار میں نہیں، وصل میں ہی کچھ لطف آتا ہے۔ ص۔۲۷۶ (بنام متوالا جی: ۲۲ راگست ۱۹۲۶ء، بنارس)

''مکرمی منشی راج بہادر صاحب کا خط بھی دیکھا تسکین ہوئی۔ آپ صاحبان کا خیال بالکل درست ہے۔ الہ آباد میں ایک برہمن پارٹی ہے۔ اودھ اپادھیائے جی اسی کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ اوٹ پٹانگ باتیں کہہ کر مجھے بدنام کر رہے ہیں، رنگ بھوم اور وینٹی فیئر میں ذرہ بھر بھی مناسبت نہیں ہے اور پریم آشرم (گوشۂ عافیت) کو ریزرکشن (Resurrection) کے مماثل بتلانا تو حد درجہ بے ہودگی ہے میں نے آج تک ریزرکشن پڑھا بھی نہیں''۔ پھر آگے لکھتے ہیں:

''حالانکہ اس کی تعریف بہت سن چکا ہوں۔ ایسی مماثلت جسے اپادھیائے جی دکھلاتے ہیں۔ قریب قریب بھی کتابوں میں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ وینٹی جز میں ایک آدمی غلط سلط انگریزی بولتا

Scanned by CamScanner

ہے اسی سے رنگ بھومی میں ایک بنگالی بابو لائے گئے۔ اس شخص کو یہ خبر نہیں کہ بنگالی بابو کیوں لائے گئے۔ اُن کے وجود کا منشا کیا ہے۔ امیلیا کو آپ صوفیہ سے ملاتے ہیں حالانکہ صوفیہ کا اصل مزاج اینی بیسنٹ ہیں۔

(بنام ورما سحر ہتگامی ۱۸ر جنوری ۱۹۲۷ء، بنارس)

عزیز من کیشو رام جی!

آپ کے نوازش نامے کا بہت شکریہ .... ہندوستان میں ادبی زندگی بہت حوصلہ شکن ہے پبلک کی طرف سے کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔ آپ اپنا دل نکال کر رکھ دیجئے لیکن عوام پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میری کسی تصنیف کا شاید ہی تیسرا ایڈیشن چھپا ہو۔ کچھ کتابوں کے تو پہلے ایڈیشن ہی ابھی ختم نہیں ہوئے ہیں۔ ہمارے کسان غریب اور ان پڑھ ہیں۔ پڑھا لکھا اور روشن خیال طبقہ یورپی ادب پر جان دیتا ہے۔ گھٹیا کتابیں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔ لیکن میری کتابوں کا حال یہ ہے کہ اُن کی تعریف تو کی جاتی ہے۔ لیکن ان کے لیے خریدار مشکل ہی سے ملتا ہے۔........... ص۔۳۲۵، ۳۲۴

(بنام کیشو رام سبھروال، ۳۱ راگست ۱۹۲۸ء، لکھنؤ)

مشفقم بنارسی داس جی!

.... کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہندی اخبار، جسے ہندی کا سب سے اعلیٰ ماہنامہ تسلیم کیا جاتا ہے، اس کی یہ حالت ہو۔ کیا یہی ہماری ترقی یافتہ ذہنیت کا معیار ہے؟ اردو کے اخبار بازی لیے جا رہے ہیں۔ پچاس سے بھی زیادہ بلند پایہ اردو ماہنامے نکلتے ہیں اور اُن میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو دو روپیہ یا ڈھائی روپے قیمت کا پانچ سو صفحوں کا سالنامہ نہ نکلتا ہو۔ یقیناً ان کا ادبی ذوق بہتر ہے۔ وہ حوصلہ افزائی کرنا جانتے ہیں ہندی شاعری اس جد و جہد کی آئینہ دار ہے جو ہمیں زندگی میں درپیش ہے نہ اس میں کوئی تڑپ ہے نہ ہی یہ زندگی بخش ہے یہ آپ کو مایوس بنا سکتی ہے اور کچھ نہیں.......... ص۔ ۶۲۱، ۶۲۰

(بنام بنارسی داس چترویدی، ۱۸ر فروری ۱۹۳۶ء، بنارس)

Scanned by CamScanner

معاف کرنا تمہارے دو خطوط آئے۔ بھشتی کی بیوی، میں نے پڑھا تھا اور بہت پسند کیا تھا۔ تم نے اردو کا ایک چھوٹا سا چٹکلا بھیجا تھا۔ میں اسے ہندی میں دے رہا ہوں۔ مگر ہندی میں جو چیزیں تم نے بھیجی ہیں۔ ان میں ابھی زبان کی بہت خامی ہے۔ ہندی کے رسالے زیرِ نظر رہیں گے۔ تو سال چھ مہینے میں یہ نقائص دور ہو جائیں گے۔ کوئی افسانہ ہمارے لیے ہندی میں لکھو۔ مگر افسانہ ہو۔ فینٹیسی نہیں یا اگر کسی واقعات کے سوانح حیات ہو تو اس سے بھی کام چل سکتا ہے مگر میری صلاح تو یہی ہے کہ ابھی زیادہ لکھنے کے مقابلہ میں لٹریچر اور فلاسفی کا مطالعہ کرتے جاؤ۔ کیونکہ اس وقت کا مطالعہ زندگی بھر کے لیے کافی ہوگا۔ ص۔۳۸۳

(بنام اُوپیندر ناتھ اشک، ۲۵ر فروری ۱۹۳۱ء، لکھنؤ)

پریم چند نے بنیادی طور پر جو انداز اختیار کیا وہ اردو اور ہندی کو قریب لانے میں معاون و مددگار ثابت ہوا ہے۔ انھوں نے ہندی کے بہت سے خطوط میں اردو کے الفاظ، محاورات، مکالمات بلکہ القاب و آداب بھی استعمال کیے ہیں اور اسی طرح اُردو کے خطوط میں ہندی کی لسانی خوبیوں کو رچا بسا دیا ہے مثلاً مہاراجہ الور کو لکھتے ہیں:

''میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔ میں نے اپنی زندگی ساہتیہ سیوا کے لیے لگا دی ہے۔ میں جو کچھ لکھتا ہوں، اسے آپ پڑھتے ہیں، اس کے لیے آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ آپ جو عہدہ مجھے دے رہے ہیں میں اس کے لائق نہیں ہوں۔ اگر ہو سکا تو آپ کے دیدار کے لیے کبھی آؤں گا۔''

ایک ساہتیہ سیوی، دھنپت رائے

ایک اور خط ملاحظہ ہو، جو لکھنؤ سے ۱۸ر مئی ۱۹۲۸ء کو کیشو رام سہر وال کو لکھا گیا۔ سہر وال جی ایک سچے دیش بھگت تھے۔ ضرورتاً ٹوکیو میں مقیم تھے۔ راس بہاری بوس کی انقلابی تحریک میں شامل تھے اور روبندر ناتھ ٹیگور کے سکریٹری بھی رہے تھے۔ ادیب اور افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے پریم چند کے کئی افسانوں کے ترجمے جاپانی میں کر کے شائع کرائے تھے۔ پریم چند انھیں لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

عزیز من کیشو رام جی!

آپ نے میرے متعلق جن اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے اُس سے مجھے بے حد تسکین و مسرت حاصل ہوئی ہے۔ کسی مصنف کے لیے اس سے بڑھ کر اطمینان اور خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ مہذب اور روشن خیال آدمی اُس کی تصنیفات کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں۔ جاپانی عوام سے تعارف، میں اپنے لیے فخر کی بات سمجھوں گا۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے زندگی کی حقیقتوں کو جس طرح میں نے بے نقاب کیا ہے اُسے وہ زیادہ پسند نہیں کریں گے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میری تصانیف جاپان میں پسند کی جائیں گی تو میری تمام کتابیں آپ کے اختیار میں ہیں۔ آپ جس کتاب کا ترجمہ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔''

اپنے اِس تفصیلی خط میں وہ آگے لکھتے ہیں:

''میں نے اپنے پبلشروں سے کہہ دیا ہے کہ وہ اُن تین کتابوں کے سوا جن کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ میری تمام ہندی کتابیں آپ کو بھیج دیں۔ اردو تصانیف، ہندی کا ہی ترجمہ ہیں۔ اردو زبان چونکہ زیادہ لوچدار اور نکھری ہوئی ہے اس لیے مختصر افسانوں کے لیے میں نے اردو ہی استعمال کی ہے۔ آپ ان افسانوں کا اردو میں زیادہ لطف اُٹھا سکتے ہیں۔''

پریم چند اردو، ہندی دونوں زبانوں میں اپنے خیالات پیش کرتے تھے، وہ مدن گوپال کو لکھتے ہیں:

''میں اردو میں تخلیق کرتا ہوں۔ میری صبح ہندی کے لیے اور شام اردو کے لیے ہے۔''

پریم چند کے خط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک بار انھوں نے محمد عاقل سے کہا تھا:

''کبھی میں اردو میں پہلے لکھتا ہوں اور اُس کا انو واد کرتا ہوں اور کبھی ہندی میں لکھتا ہوں اور بعد میں اُس کا اردو میں ترجمہ کرتا ہوں۔''

مکتوباتِ پریم چند کے موضوعاتی مطالعے میں سماجی، سیاسی، صحافتی، ادبی نفسیاتی اور رسمی جیسے عنوانات کے تحت مکتوبات کی شیرازہ بندی کی گئی ہے۔ ایک سو اڑتیس (۱۳۸) سماجی، تراسی (۸۳) سیاسی، ایک سو دس (۱۱۰) صحافتی، ایک سو ستر (۱۷۰) ادبی، انچاس (۴۹) نفسیاتی) اور ایک سو چالیس (۱۴۰) رسمی

Scanned by CamScanner

خطوط کے توسط سے انسانی نفسیات، خواہشات، جذبات، احساسات کے مختلف گوشوں تک رسائی حاصل کی گئی ہے۔ اور پھر اس تفصیلی مطالعے کے توسط سے مکتوب نگار کی جو شبیہہ اُبھرتی ہے وہ مکمل طور پر ایک انسان کی، ایک ادیب کی، ایک فنکار کی ہوتی ہے جو ان گنت حادثات سے گزرنے کے بعد نکھرتی ہے، سنورتی ہے۔ شخصیت کی اس تخلیقی جہت کی تشکیل بڑی دشوار، پُر پیچ اور خارزار ہوتی ہے۔ ضرورتیں اُسے کمزور بناتی ہیں مگر فولادی عزائم ثابت قدمی کا ثبوت دیتے ہیں اور اُس کی تشکیل میں معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ ان خطوط میں موصوف کی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں، دبی دبی، سہمی ہوئی خواہشیں بھی جھانکتی نظر آتی ہیں۔ جنھیں پورا کرنے کے لیے اُسے کبھی کبھی عام انسانوں جیسا رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ بلاشبہ شخصیت کا یہ رُخ قاری پر ادیب کے خطوط سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ اسی لیے آج مکتوب کے مطالعہ کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

پریم چند کے تقریباً تمام خطوط اپنے وقت کے نامور ادیبوں کے نام ہیں جیسے اردو میں دیانرائن نگم، امتیاز علی تاج، مولوی عبدالحق، حُسام الدین غوری، اُپندر ناتھ اشک، محی الدین قادری زورؔ، سجاد ظہیر، منشی دُرگا سہائے سُرور، اختر حسین رائے پوری اور ہندی میں جینیندر کمار، بنارسی داس چترویدی، جئے شنکر پرساد، سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا، بچن شرما اُگر، ونود شنکر ویاس، شیوپوجن سہائے، مہادیوی پرساد، آنند راؤ جوشی، اُوشا دیوی، آچاریہ نریندر دیو وغیرہ۔ اسی لیے الفاظ عبارت، پیش کردہ خیالات، عام سطح سے قدرے بلند ہیں۔ ان میں بیان کی ہوئی باتیں کچھ اس انداز سے سامنے آتی ہیں کہ کسی خاص مقام یا وقت میں محدود نہ ہوتے ہوئے بھی اہم اطلاعات مہیا کرا دیتی ہیں۔ ان خطوط سے جہاں ہمیں اُفراد کے بارے میں معلومات ملتی ہیں وہیں اُس دور کے ایسے واقعات کا بھی علم ہوتا ہے جو دوسرے ذرائع سے ہمارے سامنے نہیں آ سکے تھے اور جن کا اشارتاً ذکر پچھلے صفحات میں کیا گیا ہے۔

Scanned by CamScanner

پریم چند کی افسانہ نگاری

پریم چند کی ادبی شخصیت کی تعمیر اور ان کی ذہنی تشکیل میں گاندھی جی ٹالسٹائی، ٹیگور اور سرت چڑ جی کی تعلیمات کا بڑا ہاتھ ہے علاوہ ازیں طلسم ہوشربا نے ان کی قوت فکر کو تیز اور فسانۂ آزاد کے مطالعہ نے ان کے اندر عصری حسیت اور سماجی حقائق کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔ گاندھی جی، ٹیگور اور سرت چڑ جی کے اثرات نے پریم چند کے ذہن کو وسعت بخشی اور انھیں حب الوطنی اور انسانی ہمدردی کے جذبہ سے آشنا کیا۔ حالی کی ادبی تحریک نے پریم چند کو سادگی اور اخلاقی اقدار سے روشناس کرایا۔ پھر پریم چند خود حساس فطرت، دردمند دل اور بیدار شعور و احساس کے مالک تھے۔ زندگی کے سنگین و تلخ حقائق، مزدوروں اور غریبوں اور عورتوں پر ہونے والے ظلم و ستم اور سرمایہ داروں اور زمینداروں کے جابرانہ رویہ نے ان کی کھلی آنکھوں اور زندہ شعور کو بہت دور تک دیکھنے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔

اس طرح پریم چند نے جاگتے ہوئے شعور و احساس، حب الوطنی اور انسانی ہمدردی سے سرشار دل اور دبے کچلے انسانوں کے دکھ درد کو محسوس کرنے والے ذہن کے ساتھ افسانوی دنیا میں قدم رکھا اور اردو افسانے کو تصوراتی شیش محلوں اونچے طبقے کی عشرت گاہوں اور شہزادوں شہزادیوں کے خوابناک جزیروں سے نکال کر کھیتوں کھلیانوں، مزدوروں، کسانوں کی بستیوں اور چوپالوں کا ہمراز و ہمنشیں اور دبے کچلے انسانوں کی زندگی کا ترجمان بنایا۔ اس طرح اردو افسانہ پہلی بار قوس قزح اور چاند ستاروں کی دھند سے نکل کر لہلہاتے کھیت، پر فضا باغ اور جھونپڑوں تک پہنچا، جہاں سے اصلی ہندوستانی کلچر جنم لیتا ہے چونکہ پریم چند کے ان افسانوں کے پس منظر میں

Scanned by CamScanner

فکر کی ادبی اور سماجی تہیں ایمانداری سے کام کر رہی تھیں اس لئے یہ افسانے زندگی کا ایسا آئینہ بن گئے جس میں اردگرد کی زندگی منعکس نظر آنے لگی اور اردو افسانہ ہندوستان کی سماجی زندگی سے ہم آہنگ اور ہندوستانی تہذیب کا ایک حصہ معلوم ہونے لگا۔

پریم چند کی ادبی زندگی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۳۶ء تک پھیلی ہوئی ہے اکتیس سال کی اس مدت میں ہندوستانی زندگی بڑے نشیب و فراز سے گذری۔ جنگ عظیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ہر اس و انتشار، سرمایہ و محنت کی آویزش اور حاکم و رعایا کے مابین کشمکش نے عام انسانوں کے عقیدے اور ان کے سوچنے سمجھنے کے انداز کو کافی متاثر کیا۔ پریم چند نے انھیں ٹوٹتے بکھرتے خوابوں اور عام انسان کے زخموں اور داغوں کو اپنے افسانوں میں مختلف انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے حالات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ ہمیں پریم چند کے افسانوں میں بھی ارتقا اور اتار چڑھاؤ نظر آتا ہے۔ ابتدائی دور میں پریم چند راجپوت سورماؤں کے قصے سنا کر ماضی کی بازیافت کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایک جذباتی نوجوان کی طرح زندگی کے مظاہر پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہیں۔ وطنیت، قوم پرستی اور پریم بھگتی کو راہ نجات قرار دیتے ہیں اگرچہ داستانوی اثرات کی وجہ سے یہ افسانے فنی اعتبار سے ہمیں مایوس کرتے ہیں لیکن ان میں حب الوطنی اور انسانی ہمدردی کے چراغ جا بجا روشن نظر آتے ہیں جو اپنا ایک دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانے سوز وطن کے نام سے سامنے آئے۔ اس مجموعہ کی تمام کاپیاں انگریزی حکومت نے ضبط کر لی۔ سوز وطن کے بعد پریم چند کی ادبی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے افسانوں میں تاریخی اور اصلاحی رنگ نمایاں ہے۔ ان اصلاحی افسانوں میں 'بازیافت'، 'جج اکبر'، 'سوتیلی ماں'، 'نجات'، 'مندر'، اور 'مستعار گھڑی' قابل ذکر ہیں۔ ان تمام افسانوں میں مقصدی رنگ نمایاں ہے، رنگینی خیال اور مناظر فطرت کی جگہ بے پناہ سوز و گداز نے لے لی ہے۔ ان افسانوں میں کردار نگاری، اتحاد اثر اور دیگر تمام فنی محاسن پائے جاتے ہیں البتہ مندر اور بازیافت جیسے کچھ افسانوں میں مقصدیت کے غلبہ کی وجہ سے کہانی پن متاثر نظر آتا ہے۔

۱۹۲۰ء تک کے افسانوں میں اصلاحی اور مقصدی رنگ نمایاں رہا۔ اس کے بعد

سیاسی تحریکوں کے اثر سے ان کے افسانوں میں سیاسی رنگ جھلکنے لگا اور ان کی اصلاحی تحریک سیاست آشنا ہوگئی اس دور میں انھوں نے بہت سے ایسے افسانے لکھے جن میں زندگی کے واقعات کو سیاسی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ جیل، بھاڑے کا ٹٹو، قاتل، ستیہ گرہ وغیرہ میں یہ سیاسی رنگ کافی غالب ہے۔

اس کے بعد ان کی ادبی زندگی کا آخری دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے افسانے قطعی طور پر تمام پچھلے افسانوں پر بھاری ہیں۔ ان میں فنی تکمیل کا احساس بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان افسانوں میں کسی نہ کسی نفسیاتی حقیقت کو کہانی کا مرکز بنایا گیا ہے اور ہر افسانے میں کسی باطنی حقیقت کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

اس دور کے افسانوں میں پریم چند ایک مصلح کا لبادہ اتار کر ایک انقلابی افسانہ نگار کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں وہ آدرشواد کے طلسمی دائرے سے نجات حاصل کر کے اس حقیقت کے معترف نظر آتے ہیں کہ بغیر انقلابی عمل کے حالات میں تبدیلی ممکن نہیں۔

پریم چند کے افسانوں کی فضا ہمیں بہت مانوس نظر آتی ہے کیونکہ انھوں نے اپنے افسانوں کا پلاٹ ہمارے معاشرے کے گوناگوں پہلوؤں سے اخذ کیا ہے۔ ان افسانوں میں دیہاتی زندگی ہنستی بولتی اور سسکتی بلبلاتی نظر آتی ہے۔ گاؤں کے توہم پرست جاہل مرد، عورت مغرور چودھری، کنجوس بنئے، رشوت خور نمبردار وغیرہ اپنی مخصوص ذہنی ونفسیاتی کیفیات وخصوصیات کے ساتھ ان افسانوں میں اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ مقدمہ بازی، مار پیٹ، عصمت فروشی، جہیز کی لعنت، بیوہ عورتوں پر توڑے جانے والے مظالم جیسے کتنے ہی سنگین مسائل ان افسانوں میں اجاگر ہوئے ہیں۔

پریم چند نے اپنے افسانوں میں بہت سے کردار پیش کئے جو حقیقت سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ یہ کردار تخیل کی دنیا کے نہ ہو کر حقیقی زندگی کے جیتے جاگتے کردار یا تصویریں ہیں یہ کردار مصنف کے ہاتھ کی کٹھ پتلی نہیں بلکہ کہانی میں پیش آنے والے واقعات کے مطابق ارتقاء کے مراحل سے گزرتے ہیں۔ یہ کردار جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں پریم چند کی زندگی کا بڑا حصہ اسی کے درمیان گزرا تھا اور انھوں نے اس طبقے کے افراد کی نفسیات کا گہرا مشاہدہ کیا تھا لہذا

انھوں نے ان کرداروں کی جو تصویر پیش کی ہے وہ سچی اور حقیقت سے قریب تر ہے امیر، غریب، مہاجن، وکیل، کسان، پٹواری اور زمیندار کی جو تصویریں پریم چند نے پیش کی ہیں وہ پریم چند کے گہرے مشاہدے اور حقیقت پسندی کی وجہ سے زندگی کی حرارت سے معمور نظر آتی ہیں۔

پریم چند کے افسانے زبان و بیان کی خوبیوں سے بھی مالا مال ہیں۔ ان کی زبان نہایت سلیس شگفتہ اور رواں ہے۔ فارسی اور ہندی دونوں کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ عبارت میں بے حد آمد اور زور ہے۔ حسب ضرورت تشبیہات و استعارات سے بھی کام لیتے ہیں بعض افسانوں میں منظر نگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ گرچہ ان کے طرز تحریر میں شاعرانہ لطافت اور رنگ آمیزی نہیں ہے لیکن انسانی زندگی اور نفسیات کے بارے میں حکیمانہ نکتے جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ مکالمہ نگاری میں پریم چند کا فن بہت نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ ہر طبقے کی نفسیات اور اس کے لب و لہجہ اور زبان و بیان سے واقف ہیں۔ اور کرداروں کے مکالموں اور باتوں کو جیوں کا تیوں اصلی شکل میں پیش کر دیتے ہیں۔ بے تکلفی اور فطری انداز بیان سے ان کی تحریروں میں دلکشی کے ساتھ ساتھ بڑی زندگی اور توانائی پیدا ہو گئی ہے۔ سادہ و سلیس ہونے کے باوجود پریم چند کی تحریریں فکر انگیز نثر کا جادو جگانے میں کامیاب ہیں۔

☆☆☆

Scanned by CamScanner

خواتین کی سماجی حالت

ہندو سماج میں عورت کے تعلق سے متعدد مسائل ایسے تھے جو پورے سماج کو گھن کی طرح کھائے جا رہے تھے اور معاشرے میں بے شمار تلخیاں پیدا کر رہے تھے۔ سب سے خستہ اور قابلِ رحم حالت بیواؤں کی تھی۔ جن کے ساتھ داسیوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ بیوہ ہوتے ہی ان کے بال کٹوا دیے جاتے تھے۔ معقول غذا، عمدہ لباس، خوشبو اور زیور سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ دوسری شادی کا تصوّر تو دور کی بات انھیں بقیہ عمر اچھے بستر پر سونا بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔ توہم پرستی کی بنا پر ان کو منحوس خیال کیا جاتا تھا۔ خوشی کے موقعوں پر ان کا دیکھ لیا جانا یا ان سے ملنا بدشگونی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ یہ کیفیت صرف بیواؤں کی نہ تھی بلکہ بعض اوقات سہاگنوں کی بھی زندگی اجیرن بن جاتی تھی۔ افسانہ 'ابھاگن' میں پریم چند نے ایک ایسی بدنصیب سہاگن کے کردار کو پیش کیا ہے۔ جو میلہ کے ہنگامے میں کھو جاتی ہے اور جب گھر واپس آتی ہے تو اس کی عفت کو داغدار سمجھا جاتا

لہ ۔ "صرف ایک آواز" مجموعہ پریم پچیسی ۔ ص ۔ ۲۴۷ ۔ ۲۴۸ ۔

Scanned by CamScanner

ہے۔ شوہر اس کو اپنی زوجیت سے علیحدہ کرتے ہوئے کہتا ہے :

"میں تمھاری پرورش کا بار اٹھانے کو تیار ہوں۔ جب تک زندہ رہوں گا تمھیں نان نفقہ کی تکلیف نہ ہونے دوں گا پر اب تم میری بیوی نہیں ہو سکتیں۔"[1]

مرجادا اپنی پاکیزگی کی قسمیں کھاتی ہے لیکن پُر شرام کچھ بھی تسلیم کرنے کو رضامند نہیں ہوتا ہے۔ اُس کا بس ایک ہی جواب ہے :

"تمھارا کسی غیر مرد کے ساتھ ایک لمحہ بھی تخلیہ میں رہنا تمہاری عصمت میں داغ لگانے کو کافی ہے۔۔۔ مرجادا دو تین منٹ تک سکتہ کے عالم میں کھڑی رہی جیسے اُسے شبہ ہو رہا ہو کہ یہ وہی گھر ہے! یہ وہی میرا شوہر ہے! یہ وہی میرا لڑکا ہے یا کوئی خواب ہے ..... دفعتاً اس نے آپ ہی آپ کہا، تو جانے دو..... بچے کو بھی نہ دیکھونگی۔ سمجھ لوں گی کہ میں بیوہ بھی ہوں اور بانجھ بھی۔"

ص ۱۹۴-۱۹۵

پریم چند نے عورتوں کے مسائل کا تذکرہ کر کے سماجی شعور کو جھنجھوڑنا شروع کیا اور معاشرے میں اس کے لئے مساوی حقوق کے طلبگار ہوئے۔ بقول صالحہ عابد حسین ان کی تعمیر کردہ دنیا میں عورت ہر رنگ میں جلوہ گر نظر آتی ہے :

"ان عورتوں میں رانیاں ہیں، ٹھکرانیاں ہیں، راجپوتانیاں ہیں، کہارنیاں، مامائیں، انائیں، محنت کش طبقے کی مزدور عورتیں، کسان زادیاں، شہر کی اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتیں جن میں فیشن پرست تتلیاں بھی ہیں اور شوقین مزاج بیویاں بھی، علم و عقل کی پتلیاں بھی اور اپنی لاج بیچنے والی طوائفیں بھی، لیکن ان میں کوئی بھی مٹی کا مادھو، کاٹھ کی پتلی، چینی کی گڑیا، بے حس بے جان پیکر نہیں۔ نہ سب خوبیوں کا مرقع ہیں نہ برائیوں کی پوٹ، آپ ہر چہرے پر زندگی کی کشمکش کی پرچھائیاں دیکھ سکتے ہیں اور ہر سینے میں عورت کے دل کی دھڑکن سنی جا سکتی ہے۔ ہر آنکھ میں عورت کی روح جھانکتی نظر آتی ہے۔"[2]

پریم چند پہلے ادیب ہیں جنھوں نے عورت کو میرا اور ساوتری کے ساتھ ساتھ درگا اور کالی کے روپ

---

[1] ۔ مجموعہ پریم چالیسی حصہ دوم۔ ص ۱۹۴۔

[2] ۔ پریم چند کے ہاں عورت کا تصور (فن اور فنکار) ص ۷۹۔

میں بھی پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ شخصیت کے سیاہ و سفید پہلوؤں کی آمیزش کی بنا پر اُن کے افسانوں میں مجموعی طور سے عورت کا کردار بلند اور پُر وقار ہوگیا ہے جو حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے کمربستہ رہتی ہے۔ پریم چند افسانہ "بازیافت" میں لکھتے ہیں کہ:

"عورت محض کھانا پکانے، بچے جننے، شوہر کی خدمت کرتے اور ایکا وشی کا برت رکھنے کے لیے نہیں ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد اس سے بہت اعلیٰ ہے۔ وہ انسان کی تمام مجلسی، ذہنی، عملی ترقیوں میں برابر کا حصہ لینے کی مستحق ہے۔"[1]

افسانہ "کُسم" بھی ان ہی خیالات و نظریات کی تائید کرتا ہے:

"مرد ـــ سمجھتا ہے کہ شادی نے ایک عورت کو غلام بنا دیا ہے۔ وہ اس کے ساتھ جتنا چاہے ظلم کرے کوئی اس سے باز پُرس نہیں کرسکتا۔ اگر اسے خوف ہوتا کہ عورت بھی اس کی اینٹ کا جواب پتھّر سے نہیں، اینٹ سے بھی نہیں، محض تھپڑ سے دے سکتی ہے، تو اسے کبھی اس بدمزاجی کی جرات نہ ہوتی۔"[2]

افسانہ "بدنصیب ماں" میں پریم چند نے عورت کی بے کسی، بے بسی، مجبوری اور لاچاری کو موضوع بناکر اس حقیقت کو عریاں کیا ہے کہ ہندو سماج میں بیوہ کا حق شوہر کی جائیداد سے محض گذارہ لینے کا ہوتا ہے، وہ بھی جب دوسروں کا لطف کرم شامل ہو۔ شوہر کے مرنے کے بعد چاروں بیٹوں کا سلوک اپنی ماں کی جانب سے پھر جاتا ہے اور وہ ہر چیز پر قابض ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ افسانہ نگار کے دعوے کے مطابق ان کو اس فعل کا حق پہنچتا ہے:

"قانون یہی ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد ساری جائیداد بیٹوں کی ہو جاتی ہے۔ ماں کا حق صرف گذارہ لینے کا ہے۔"[3]

نہ صرف یہ کہ ان کا سلوک ماں کے ساتھ خراب ہے بلکہ وہ اخراجات سے بچنے کے لیے اپنی کم سن بہن کمد کی شادی ایک معمّر آدمی سے کردیتے ہیں۔ ماں اس حد تک مجبور ہے کہ خاموش تماشائی بنی رہتی ہے۔

---

[1] ۔ "بازیافت"، تہذیب نسواں، ۲۰ر اپریل ۱۹۱۸ء۔ ص۔ ۲۵۱۔

[2] ۔ "کُسم"، عصمت، سالگرہ نمبر ۱۹۳۲ء۔ ص۔ ۱۳۴-۱۳۵۔

[3] ۔ "بدنصیب ماں" مجموعہ واردات۔ ص ۵۰۔

Scanned by CamScanner

اور کمّد کے لیے دیگر کنواری لڑکیوں کی طرح معیارِ شرافت۔ یہی ہے کہ وہ اپنی شادی کے بارے میں بھی کسی طرح کی رائے نہ دے کر خاموش رہے۔ اس طرح ایک معصوم اور کمزور لڑکی اپنے بھائیوں کے حرص کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے:

"چاروں بھائی بے حد خوش تھے۔ گویا ان کے پہلو سے کانٹا نکل گیا ہو"[۱]

طوائف کا مسئلہ: عورت فطرتاً نرم و نازک، معصوم اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ اس کی رگ و پے میں ممتا و محبت کا جذبہ موج زن رہتا ہے۔ وہ بیک وقت ماں، باپ، بھائی، بہن، محبوب، شوہر اور بچوں سبھی سے پیار کرتی ہے۔ سائے کی طرح ساتھ رہ کر اُن کی خدمت اور حفاظت کرتی ہے۔ اُن کی خوشیوں پر اپنے سکھ چین نثار کرتی ہے۔ اسی لیے اس کی شخصیت بڑی محترم اور قابلِ ستائش ہے۔ وہ آفتاب کی ضیا پاش کرنوں، ماہتاب کی ٹھنڈی چھاؤں، اٹھکھیلیاں کرتی ہواؤں، برسات کی رم جھم پھواروں اور ہلچل مچاتی ہوئی ندیوں کی طرح ہے جس کا سلوک سب کے ساتھ مساوی ہوتا ہے۔ اس کو ایسی زرخیز زمین سے تشبیہ دی جاتی ہے جو ہر زخم کو سینے پر جھیلتی ہوئی اپنی ضیافتوں سے سبھی کو شکم سیر کراتی ہے۔ شرافت، ایثار اور قربانی کا مجموعہ ہونے کے باوجود اُسے دنیاوی دستور میں کمزور، ناقص العقل، فتنہ و فساد کی جڑ، دو دھاری تلوار اور زہریلی ناگن جیسے ان گنت خطابوں سے بھی نوازا گیا ہے۔ اسے دینی اور دنیاوی ترقی کی راہ کا سب سے بڑا پتھر سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ اسی عورت نے اپنی کوکھ سے ایسی نادر ہستیوں کو جنم دیا جنھوں نے دنیا کو امن اور انسانیت کا پیغام دیا مگر اس ابھاگن کا مقدّر مرد کی حکومیت نے تنگ و تاریک کر دیا۔ اُسے دان اور خیرات کی چیز سمجھا گیا، ستی اور جوہر کے جالوں میں پھانس کر زندہ جلایا گیا، پاکیزگی کی ضمانت کے لیے دہکتے ہوئے شعلوں سے گذارا گیا مگر اس نے صبر و قناعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اردھانگنی بن کر شوہر کو ناخدا تصور کرنے والی عورت، ہر طرح کے برتاؤ کو برداشت کرتے ہوئے سہاگ کی سلامتی اور درازیٔ عمر کی دعائیں مانگتی رہی۔ لیکن زمانے نے اس کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔ محافظوں نے شوہر کی نظر پھرتے یا بیوہ ہوتے ہی اُسے گِدھ کی طرح نوچنا شروع کر دیا۔ اس طرح حالات کی ستم ظریفی نے اُسے عصمت فروش بناتے ہوئے بازارِ حُسن میں بیٹھنے پر مجبور کیا۔ اُس کے دیدار کو ناپاک کو تصور کیا گیا

---

[۱] "بدنصیب ماں" مجموعہ واردات۔ ص ۵۳۔

Scanned by CamScanner

اور خود اسے ڈائن، بدقماش، بیسوا، رنڈی، طوائف جیسے الفاظ سے مخاطب کیا گیا۔ حالانکہ یہ گھناؤنا علاقہ عورت کی آخری پناہ گاہ ہے جہاں وہ طوعاً و کرہاً داخل ہوتی ہے اور پھر اس دلدل میں دھنستی ہی چلی جاتی ہے۔ صدیوں سے بنائی ہوئی زنانِ بازاری کے وجود کو فروغ دینے میں ہندوستان کی چند فرسودہ روایتیں بھی معاون رہی ہیں۔ مدن موہن سکسینہ شاستروں کے توسط سے اس تاریک پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تمام سوتروں میں پرانے زمانے کی بیسواؤں کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے مطابق سوناروں اور شلپ کاروں کی عورتوں کے ساتھ غیر مرد جماع کر سکتا تھا۔ سوتوں سے کم درجہ پانے والی، جوان اور بیوہ جو خوبصورت تھیں لیکن جس کا شوہر پردیس میں رہتا تھا یا جس کا شوہر بدصورت ہوتا تھا یا بیمار رہتا تھا، اس کے ساتھ غیر مرد جماع کر سکتا تھا۔ پدم پُران سے پتہ چلتا ہے کہ خوبصورت لڑکیوں کو خرید کر مندر کو دان کیا جاتا تھا جہاں پجاری اُن کے ساتھ ہم بستری بھی کرتے تھے۔"[1]

عورت کی اپنی لاچاری و مجبوری، ہوس کاروں کی نفسانی ترغیب اور سماجی جبر اسے طوائف کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ کبھی کبھار وہ آوارہ مزاجی اور جنسی تلذّذ کا شکار ہو کر خود ویشیا بن جاتی ہے۔ بہر حال پریم چند نے اس کی ذات کے کرب کی شدّت کو محسوس کرتے ہوئے اسباب و علل تلاش کیے ہیں اور مثبت انداز سے ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے متعدد افسانوں میں عورت کے سماجی مرتبہ کی وکالت کی ہے اور اُسے معاشرہ میں باعزّت طریقہ سے واپس لانے کے لیے راہیں ہموار کی ہیں۔ پریم چند اپنے اس مطمحِ نظر کا محاسبہ "مزارِ اُلفت" کے کنور صاحب کی شکل میں کرتے ہیں جو طوائف زادی سلوچنا کو غلاظت کے ماحول سے نکال کر خوشگوار فضاؤں میں پروان چڑھانا چاہتا ہے۔ جہاں وہ آزادی کی سانس لے سکے:

"اُن کی دلی آرزو تھی کہ اس کی شادی کسی ممتاز اور شریف خاندان میں ہو۔ وہ اس کی پیشانی سے وہ داغ دھو دینا چاہتے تھے جو گویا تقدیر نے اپنے بے رحم ہاتھوں سے لگا دیا تھا۔ دولت تو اس داغ کو نہ دھو سکی شاید تعلیم دھو ڈالے۔" (پریم چالیسی حصّہ دوم۔ ص ۱۶۳)

---

[1] ساماجک وِگھٹن، مدن موہن سکسینہ۔ ص ۳۷۸ (ہندوستانی بک ہاؤس، کانپور۔ ۱۹۷۳ء)

بے جوڑ شادی کا انجام: پریم چند نابرابری کی شادیوں کے بھیانک نتائج سے بھی عوام الناس کو باخبر کرتے ہیں۔ اس طرح کی شادیوں کا اختتام عموماً عورت کی بے راہ روی، گھٹ گھٹ کر مرنا یا پھر خودکشی پر ہوتا ہے لہٰذا پریم چند ایسے تباہ کن انجام سے سماج کو ہوشیار کرتے ہیں۔ "زادِ راہ" کی سوشیلا اپنی نوعمر بیٹی ریوتی کے پیغام پر بے چین ہو اٹھتی ہے اور سیٹھ جھابرمل کے بارے میں کہتی ہے:

"یہ پچاس سال کا کھوسٹ اور اس کی یہ ہوس..... یہ احمق سمجھتا ہے کہ لالچ میں آکر اپنی پھول سی لڑکی اس کے گلے میں باندھ دوں..... نام کے لیے ساری جائداد کھوئی، زیور کھوئے، مکان کھویا، لیکن لڑکی کو کنویں میں نہیں ڈال سکتی۔" (مجموعہ زادِ راہ۔ ص ۱۸۹)

افسانہ "نئی بیوی" بھی اسی موضوع سے متعلق ہے۔ ضعیف العمر لالہ ڈنگا مل پہلی بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی نوجوان آشا سے کر لیتا ہے اور دواؤں کے سہارے آسودگی فراہم کرنے کا جتن کرتا ہے۔ اس کے باوجود اپنی ازدواجی زندگی میں ناکام رہتا ہے۔ آشا فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر جگل سے تعلقات استوار کر لیتی ہے:

"آشا اپنے عمر رسیدہ شوہر سے جنسی تشفی حاصل کرنے میں ناکام ہو کر رشتوں اور اخلاق کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے نوکر جگل سے یہ کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی جاتی ہے کہ لالہ کھانا کھا کر چلے جائیں گے تم ذرا آجانا۔" (ماہنامہ افسانہ، لاہور۔ مئی ۱۹۳۳ء۔ ص ۱۱)

Scanned by CamScanner

بیوہ کی شادی کی وکالت:

پریم چند بیوہ کی شادی کے زبردست مبلغ ہیں۔ وہ افسانہ "مجبوری" کے توسط سے حساس قاری کی توجہ اس جانب مبذول کراتے ہیں کہ کہیں بیوہ احساس کمتری کا شکار ہو کر کیلاشی کی طرح "سنیاس" اختیار نہ کر لے:

"بیوہ ہونا کسی بڑے گناہ کی سزا ہے یہ خیال اس کے دل میں راسخ ہوتے لگا میں نے پچھلے جنم میں کوئی بڑا گناہ کیا ہوگا — میری نجات اب تیاگ، بھگتی اور اُپاسنا سے ہی ہوگی۔"[1]

پریم چند انسانی جبلت اور فطری تقاضوں کا علم رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کم سن یا جوان بیوہ کے لیے زندگی کے طویل سفر میں باعصمت رہ کر دن گذار لینا انتہائی دشوار ہے۔ نفسانی خواہش کسی لمحہ امتیاز و تفریق کو فراموش کر سکتی ہے۔ افسانہ "مجبوری" میں وہ پردے تانتھ کی زبانی اسی خوف و اندیشہ کا احساس دلاتے ہیں:

"کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ بیواؤں سے استانیوں کا کام لینا چاہیے — منشا تو صرف یہی ہے کہ لڑکی کا دل کسی کام میں لگا رہے۔ کسی سہارے کے بغیر بھٹک جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ جس گھر میں کوئی نہیں رہتا اس میں چمگادڑ بسیرا لیتے ہیں۔"[2]

افسانہ 'مالکن' بھی اسی اہم مسئلہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ جہاں بیوہ رام پیاری فطری مجبوریوں کے تحت اپنے نوکر جوکھو کے قریب ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح پریم چند صنف افسانہ کے ذریعے نہ صرف عورتوں کی فلاح و بہبود کے جتن کرتے رہے بلکہ قوم کے ضمیر کو بیدار کرتے ہوئے نجات کی راہیں بھی دکھلاتے رہے۔ وہ 'علیحدگی' میں بیوہ کی شادی کے خوشگوار پہلوؤں کو بڑے پُر لطف پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ دو بچوں کی ماں ملیا جب حالات سے تنگ آ کر اپنے دیور سے شادی کر لیتی ہے تو اس کی ویران زندگی میں پھر سے بہار آ جاتی ہے:

"بیوگی کے غم میں مرجھائی ہوئی ملیا کا زرد چہرہ کنول کی طرح سرخ ہو گیا، دس سال میں جو کچھ کھو یا تھا وہ ایک لمحہ میں سود کے ساتھ مل گیا۔ وہی تازگی، وہی شگفتگی، وہی ملاحت اور وہی دلکشی....."[3]

1۔ "مجبوری" مجموعہ پریم چالیسی حصہ دوم۔ ص ۱۳۴

2۔ " " " " ص ۱۳۶

سوزِ وطن

"سوزِ وطن" کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" داستانوی طرز میں ڈوبا ہوا رومانی افسانہ ہے۔ اس افسانہ میں پریم چند نے آزادئ وطن کی قدر و قیمت بتا کر ہندوستانی عوام کو مذکورہ جذبہ کی جانب راغب کیا ہے۔ افسانہ کا ہیرو دل فگار ہیروئن ملکہ دل فریب سے بے پناہ عشق کرتا ہے اور شادی کا پیغام پہنچواتا ہے۔ ملکہ یہ شرط رکھتی ہے کہ پہلے وہ اُسے دنیا کا سب سے انمول رتن لاکر دے۔ دل فگار انمول رتن کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے مگر پس و پیش میں مبتلا رہتا ہے کہ کونسا تحفہ محبوب کے حضور میں پیش کرے؟ "آنکھ سے ٹپکا ہوا آخری آنسو" اور "ستی کی راکھ" نامنظور ہوتے ہیں۔ بالآخر حضرت خضر کی نشاندہی پر وہ ہندوستان کے ایک ایسے میدان جنگ میں پہنچتا ہے جہاں سیکڑوں مُردہ اور نیم مُردہ سپاہی نظر آتے ہیں۔ ایک دم توڑتا ہوا سپاہی اس کو اپنے قریب بٹھا کر کہتا ہے:

"اگر تو مسافر ہے تو آ اور میرے خون سے تر پہلو میں بیٹھ جا۔ کیونکہ یہی دو انگل زمین ہے جو میرے پاس باقی رہ گئی ہے اور جو سوائے موت کے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

شدّتِ جذبات سے مغلوب ہو کر راجپوت سپاہی "بھارت ماتا کی جے" کا نعرہ لگاتا ہے جس کے ساتھ ہی

Scanned by CamScanner

اس کے سینہ سے خون کا آخری قطرہ نکل کر دیش بھگتی کا حق ادا کر جاتا ہے۔ دل فگار وہ آخری قطرۂ خون لے کر ملکہ دل فریب کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے اور اسے ملکہ کی خدمت میں نذر کرتا ہے۔ ملکہ اس انمول نذرانے کو محبت اور احترام سے قبول کرتی ہے۔ اس موقع پر پریم چند نے اپنے جذبۂ حریت کا اظہار ملکہ دل فریب کی زبانی اس طرح کیا ہے:

"اے عاشق جاں نثار! آج سے تو میرا آقا اور میں تیری کنیز ناچیز" کیونکہ "وہ قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے، دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے"[1]

مجموعہ کا دوسرا افسانہ "شیخ مخمور" بھی وطن پرستی کے جذبات پر مشتمل ہے۔ اس افسانہ میں شہزادہ مسعود شیخ مخمور کے بھیس میں اپنے سپاہیوں کو خطاب کرتا ہے۔ شہزادہ کی تقریر دراصل پریم چند کے خیالات کی ترجمان ہے:

"ہم نے یہ جنگ توسیع سلطنت کے کمینے ارادے سے نہیں چھیڑی۔ تم حق اور انصاف کی لڑائی لڑ رہے ہو۔ کیا تمہارا جوش اتنی جلدی ٹھنڈا ہو گیا؟ کیا تمہاری تیغ انصاف کی پیاس اتنی جلدی بجھ گئی؟ تم جانتے ہو کہ انصاف اور حق کی فتح ضرور ہوگی۔ ہاتھوں میں تیغ مضبوط پکڑو اور نام خدا لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑو، تمہارے تیور کہے دیتے ہیں کہ میدان تمہارا ہے"

"سوز وطن" کا تیسرا افسانہ "یہی میرا وطن ہے"، انداز بیان کے اعتبار سے پچھلے دونوں افسانوں سے قدرے جدا ہے مگر موضوع کے لحاظ سے اس افسانہ میں بھی سابقہ جذبات کی کارفرمائیاں ہیں۔ افسانہ کا ہیرو ایک ایسا دیش بھگت ہے جو ساٹھ سال سے امریکہ میں رہتے ہوئے یہ خواہش رکھتا ہے کہ زندگی کا خاتمہ اپنے پیارے بھارت میں ہو۔ حالانکہ امریکہ میں اسے دولت اور شہرت کے علاوہ حسین بیوی اور سعادت مند بچے ملے ہیں جنھوں نے اس کی تجارت میں چار چاند لگائے ہیں۔ مگر وہ سب کو چھوڑ کر اپنے دیس کو چل دیتا ہے تاکہ اس کی خاک پاک میں دفن ہو سکے۔ بمبئی میں جہاز سے اترنے کے بعد وہ قرب و جوار کے ماحول کو دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ "یہ میرا پیارا دیس نہیں، یہ میرا پیارا بھارت نہیں" اس طرح کے تکلیف دہ الفاظ بمبئی سے گاؤں تک وہ پانچ بار دہراتا ہے۔ ابتداءً زندگی کی کسمپرسی اور مغربی انداز کی اندھی تقلید پر، پھر گاؤں میں بندوق لیے انگریزوں اور لال پگڑی والوں کے تشدد کو دیکھ کر، اس کے بعد قدیم تہذیب، روایات اور اخلاقی اقدار کی تنزلی دیکھ کر۔ وہ تمام رات چوپال کے پاس ذہنی کرب

---

[1] "دنیا کا سب سے انمول رتن" ماہنامہ تعمیر ہریانہ، میرا پہلا افسانہ نمبر، اکتوبر۔ نومبر ۱۹۷۸ء۔ ص ۱۱۔

میں مبتلا رہتا ہے اور سوچتا ہے کہ ہم وطنوں نے انگریزوں کے اثرات قبول کر لیے ہیں اس لیے امریکہ واپس چلنا چاہیے۔ لیکن طلوع ہوتی ہوئی صبح کا پیارا بھجن "پربھو میرے اوگن چت نہ دھرو شیام بھگت میرا" اور "شیو شیو ہر ہر نارائن" کی صداؤں کے تعاقب میں وہ گنگا کے کنارے پہنچ کر چیخ اٹھتا ہے کہ :

"ہاں ہاں یہی میرا دیش ہے۔ یہی میرا پیارا وطن ہے۔ یہی میرا بھارت ہے اور اسی کے دیدار کی،
اسی کی خاک میں پیوند ہونے کی حسرت دل میں تھی۔"

مجموعہ کا پانچواں افسانہ "عشق دنیا و حُبِّ وطن" ہے۔ یہ افسانہ اپنے عنوان سے ہی وطن پرستی کا درس دیتا ہے۔ اس افسانہ میں پریم چند نے اٹلی کے ایک عظیم کردار میزینی کو بڑے رومانی انداز میں پیش کیا ہے جس نے ملک کی آزادی اور جمہوری نظام کے قیام کے لیے انتھک جد وجہد کی۔ اپنی تمام خوشیوں کو قربان کرتے ہوئے اُس نے ظلم اور جبر کو برداشت کیا اور زندگی کے آخری لمحوں تک سرفروشی اور جانبازی کا ثبوت دیا۔

Scanned by CamScanner

سادہ اور براہ راست اسلوب:

پریم چند نے اپنے افسانوں میں سادہ زبان استعمال کی۔ انھوں نے سنسکرت الفاظ کا کم سے کم استعمال کیا۔ انھوں نے اکثر کرداروں کے مکالمے ان کی معاشی اور معاشرتی حیثیت کے مطابق لکھے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے لیے مکالمے ان کے لہجے اور تلفظ میں تخلیق کیے۔ جو پریم چند کے زبردست مشاہدے کا غماز ہے۔ پریم چند نے ہندوستان کے لوگوں کو حقیقت پسندی سے روشناس کرایا۔ اُس وقت جب ہندوستان میں مذہبی داستانیں اور مافوق الفطرت موضوعات عروج پر تھے، پریم چند نے بین الاقوامی، ملکی، علاقائی، معاشرتی اور معاشی مسائل پر قلم اٹھایا۔ انھوں نے ہندوستان کے دیہی موضوعات سے ساتھ ساتھ متوسط شہری زندگی کے مسائل پر بھی لکھا۔ آخری دور کے افسانوں میں پریم چند ایک عظیم افسانہ نگار دکھائی دیتے ہیں۔ اس دور کے افسانے مقامی ہونے کے باوجود آفاقی کہلانے کے مستحق قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ اب ان کے افسانوں میں وہ تمام خوبیاں پیدا ہوگئی تھیں جو اچھے اور معیاری افسانوں کا خاصہ سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی زبان بھی صاف ہوگئی تھی اور انداز بیان میں بھی دلکشی آگئی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت جملے استعمال کرنے لگے تھے۔ سادگی و پرکاری، ندامت و سنجیدگی ان کی تحریروں کے جوہر تھے۔ منظر کشی میں بھی انھیں کمال حاصل ہوگیا۔

ہمیں سب سے پہلے یہ سمجھنا ہوگا کہ پریم چند کو اردو قصہ نویسی کی کون سی روایت ملی اور اس سے ان کے اخذ و استفادہ اور رد و قبول کا عمل کس نوعیت کا رہا۔ ان کی تفصیلات کے لیے مندرجہ ذیل سوالات پر غور کرنا ضروری ہے۔

۱۔ انھوں نے اردو نثر کی اس روایت کو آزمانے کی کوشش آخر کیوں نہیں کی جس میں سجاد حیدر یلدرم

لے مبادیات افسانہ نگاری، پیارے لعل شاکر میرٹھی، ادبی دنیا، فروری ۱۹۰۴ء، رسالہ ادبی دنیا، جلد ۱۰، ص: ۴۳

Scanned by CamScanner

اور دوسرے لکھنے والے داد وصول کر رہے تھے؟

۲۔ رجب علی بیگ سرور اور محمد حسین آزاد کے اسالیب بیان نے انھیں اپنی طرف کیوں نہیں کھینچا۔؟

۳۔ آخر وہ میر امن، غالب اور سرسید کی بنائی ہوئی سادہ گوئی کی نثری روایت کی طرف روزِ اوّل سے کیوں متوجہ ہو گئے۔؟

۴۔ کیا انیسویں صدی کی اس نثری روایت کو پریم چند نے ہو بہو اپنا لیا یا اس میں کچھ باتیں شامل کیں یا کم کیں۔؟

اگر ان سوالات کے جواب نہ حاصل ہوں تو پریم چند کے اس ادبی اجتہاد کو بھلا کوئی کیسے سمجھ پائے گا جس کی وجہ سے انھیں امتیاز حاصل ہوا۔ پریم چند کو اوّلاً اردو کے رومانوی افسانہ نگاروں کی سحر طراز نثر نے لبھایا ہوگا۔ سجاد حیدر یلدرم کی ہمہ دانی کا رعب بھی کم نہیں تھا۔ اس نثر کی روایت علمی سکّہ بٹھانے کے لیے موزوں ترین سہارا تھی۔ نوطرز مرصع اور فسانہ عجائب کے لکھنے والوں کا جادو ابھی بھی لکھنو کے علمی مزاج کے طفیل برقرار تھا۔ ایک نئے لکھنے والے کی حیثیت سے پریم چند کے لیے یہ آسان ہوتا کہ ایسے اسلوب کا استعمال کریں جس میں علمی جاہ وجلال اپنے آپ گھن گرج کرتے نظر آئیں، لیکن اردو قصہ نویسی کے باب میں شاید پریم چند کی ترجیحات دوسری تھیں۔ اس لیے انھوں نے رومانوی اور منشی صبح عبارتوں کے سحر انگیزی سے خود کو دور رکھا۔

لیکن کیا فورٹ ولیم کالج سے جس نثری روایت کا آغاز ہوا تھا، پریم چند نے اسی پر قناعت کر لی اور اُن کی زبان کو اسی لیے میر امن، غالب، سرسید کے بعد اگلا قدم تصور کر لیا جائے؟ شاید یہ کہنا جلد بازی ہوگی۔ میر امن نے زبان کا ایک نیا ڈھانچہ تیار کیا تھا۔ انھوں نے اپنی زبان کے بارے میں دو باتیں لکھیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے ''اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔'' دوسری بات باغ و بہار کی زبان اور اس کے بولنے والوں کی شناخت سے وابستہ تھی۔ انھوں نے کہا: ''ٹھیٹھ ہندستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ، ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں''۔ بلاشبہہ یہ ایک نیا لسانی فلسفہ تھا جس کی بنیاد پر میر امن نے اردو کی ایک علاحدہ نثری روایت ایجاد کی۔ اس پر غالب نے اپنے مکتوبات کے ذریعے نئے ذہن کی فکر اور سرسید نے وسیع النظری کے اضافے کیے۔ میر امن اور غالب سے جو قافیہ پیمائی ختم نہیں ہو رہی تھی، سرسید نے اسے میدان سے باہر کر دیا۔

Scanned by CamScanner

لیکن نثر کی اس روایت میں پریم چند کو اور بھی بہت کچھ کرنا تھا۔ سابقین نے عوامی لہجے کی دریافت اور ان کے مزاج کے اعتبار سے نثر نگاری کی روایت تو بنائی تھی لیکن کیا اس لسانی ڈھانچے میں کوئی عوامی روح ڈالی جا سکی تھی۔ میر امن کے یہاں بجا طور پر خالص ہندوستانی گفتگو ہے لیکن قصے کے کردار بادشاہ اور شہزادے شہزادیاں وغیرہ ہی ہیں۔ خطوطِ غالب میں ایک آزاد ذہن کی اُڑان ہے لیکن فکرمندی صرف اپنے جیسے لوگوں کے لیے۔ کہتے ہیں: ''یہاں اغنیا کے ازدواج بھیک مانگتے پھریں، اسے دیکھنے کے لیے جگر چاہیے''۔ سرسید مغربی تعلیم کی وکالت اور سماج کی جدید کاری کے روح رواں لیکن کمزور طبقے، پیشے ور برادریاں اور عورتوں کو اس نئے تعلیمی محاذ سے اس لیے دور رکھا جائے کیوں کہ ان میں اعلا عہدوں تک پہنچنے کا سنسکار نہیں۔ یعنی میر امن سے لے کر سرسید احمد خاں تک ایک اشرافیت اور اعلا طبقے کے لیے فکرمندی کا رویہ تھا۔ مشہور ادبی اصطلاح کا استعمال کریں تو کہنا پڑے گا کہ میر امن، غالب اور سرسید کی نثر نگاری کا اسلوب عوامی تھا لیکن مواد عوامی نہیں تھا۔ یعنی ظاہری طور پر یہ نثر عام لوگوں کی طرح برتاؤ کرتی ہے لیکن داخلی اعتبار سے اس کا سروکار عوام سے بالکل نہیں۔ اس نثر کے متعلقات خاصے اشرافیت زدہ تھے۔

تاریخ کے اسی موڑ پر پریم چند نے انیسویں صدی کی مختلف نسلوں کے ذریعے آزمائی ہوئی نثر کو ہندستان کے دیہی سماج کا ترجمان بنا کر پیش کیا۔ افسانوں اور ناولوں میں اب شاہانِ وقت، امرا، رؤسا اور لاٹ صاحبوں کے بجائے ایسے لوگ اُبھرنے لگتے ہیں جنھیں نہ دولت نے کبھی سرآنکھوں پر بٹھایا اور نہ ہی کبھی علم و فضل کی دستار اُن کے حصے میں آئی۔ بھوک ان کا ایسا مسئلہ ہے جس کے پار کوئی دنیا نظر ہی نہیں آتی۔ یہ جماعت مرتب اور مقفّٰی کیا جانے، ٹوٹے پھوٹے اور جانے انجانے لفظوں سے اپنی کچھ بات کہہ لیتی ہے، یہی بہت ہے۔

اردو فکشن میں بیسویں صدی کے روزِ اول سے پریم چند ایسے ہی طبقے کی نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ابتدائی ناولوں اور افسانوں کو اگر ہم عشقیہ سمجھ کر چھوڑ دیں تو یہ ہماری بڑی بھول ہوگی۔ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' ہے تو ایک عشقیہ افسانہ لیکن آخر حکومتِ برطانیہ کو کیوں 'سوزِ وطن' کو ضبط کرنا پڑا۔ اس کی کہانیاں ہندوستانی سماج کے مزاج کو بدلنے کی طاقت رکھتی تھیں۔ پریم چند ایک ایسے طبقے کی زبان میں اسی کی کہانیاں، خواب اور تمنائیں رقم کر رہے تھے جس پر آج تک کسی نے چار سطریں

Scanned by CamScanner

بھی نہیں لکھیں۔ پریم چند پر غور وفکر کے دوران اگر ہم اُن کے اس اجتہاد پر تفصیل سے روشنی نہیں ڈالتے تو میرا یقین ہے کہ پڑھنے والوں کے دماغ پر ایک غیر معمولی ذہن کے عظیم فن کار کا وہ طلسم نہیں قائم ہو پائے گا جس سے پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کے مطالعے میں ان کی گہری دلچسپی پیدا ہو سکتی تھی۔

Scanned by CamScanner